

پیش لفظ

یہ تحریر جو درحقیقت ایک انتہائی اہم دینی موضوع پر نادر دستاویز کا درجہ رکھتی ہے، مولانا گوہر رحمنؒ کے عالمانہ قلم کا شاہکار ہے۔ مولانا گوہر رحمنؒ کی شخصیت اسلامی تحریکات سے وابستہ اصحاب کے لئے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ سکھ بند عالم دین اور مردان میں ایک عظیم الشان دارالعلوم کے مہتمم و صدر مدرس تو تھے ہی، پاکستان میں غلبہ و اقامت دین کے لئے جدوجہد کرنے والی ایک نمایاں دینی سیاسی جماعت کے قائدین اور فکری رہنماؤں میں بھی ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ اس بات پر اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ اس دورِ فتن میں جب کہ کوئی شعبہ زندگی بھی اضمحلال اور انتشار سے محفوظ نہیں ہے، ایسے حق پرست اور باطل شکن اہل علم کا وجود برقرار رہا۔

زیرِ نظر مضمون دراصل اُس علمی ورثہ کا تسلسل ہے جو ”وجوبِ خلافت“ اور ”نصبِ امامت“ کے عنوانات کے تحت ہمیشہ سے ہمارے دینی لٹریچر کا جزوِ لا ینفک رہا ہے۔ یہ علمی بحثیں لٹریچر میں تو موجود ہیں، البتہ اسلامی اجتماعیات یعنی نظامِ خلافت کے مکمل انہدام، قریباً دو صدیوں پر محیط انگریز کی غلامی اور سیکولر ازم اور لادینیت کے غلبہ و تسلط کے سبب سے بہت سے دینی حلقوں کی نگاہوں سے اوجھل اور ذہنوں سے محو ہو گئیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ دین اسلام جو زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تمام گوشوں کو محیط ہے اور مسلمانوں سے اللہ کے عطا کردہ قانون کے غلبہ و نفاذ کا مطالبہ کرتا ہے، انفرادی زندگی کے ایک مختصر سے گوشے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ تاہم اس عرصے میں بھی علماء کرام اور رجال دین کا ایک گروہ ناموافق حالات کے باوجود دین کے جامع تصور، اُمت کی اجتماعی ذمہ داریوں اور مسلمانوں کے دینی فرائض کی یاد دہانی جیسے اہم کام کو اپنا مقصدِ حیات بنا کر سرگرم عمل رہا۔ اُن کی کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں ایک عام بیداری اور بحیثیت اُمت

التزامِ جماعت

شائع کردہ:

شعبہ دعوت و تربیت

تنظیم اسلامی پاکستان

مرکزی دفتر: A-67 علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

فون: 36271241-36293939-36366638 فیکس:

www.tanzeem.org

اپنی دینی ذمہ داریوں کا شعور از سر نوا جا کر ہوتا نظر آیا! لیکن اس بد نصیبی کا کیا کیجئے کہ اسلام کو دورِ حاضر کے فکر و فلسفہ اور مغربی تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگ بنانے کے لئے بعض ایسے عناصر ختم ٹھونک کر میدانِ عمل میں کود پڑے ہیں جو آج ”علیت“ کے پردے میں دین کے مسلمات کی جڑوں کو کھودنے اور نام نہاد ”روشن خیال اور اعتدال پسند“ اسلام کو فروغ دینے اور مسلمانوں کو باطل نظام اور غیر اللہ کی حاکمیت کے تحت مطمئن زندگی گزارنے کا سبق پڑھا رہے ہیں۔

اجتماعیات کے میدان میں ”اقامت دین کا کیا مفہوم ہے“ اس کی غرض و غایت اور اہمیت کیا ہے، التزام جماعت کا کیا مفہوم ہے.... اور کیا ”الجماعۃ“ سے مراد آج کی باطل پرست جمہوری یا آمرانہ حکومتیں ہیں یا اس کا کچھ مختلف مفہوم ہے، اس مقالے میں اُن تمام اہم امور کا انتہائی مدلل انداز میں احاطہ کیا گیا ہے جن کے حوالے سے کچھ عناصر مسلمانوں میں انتشار فکری پھیلانے کے درپے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ تحریر نہ صرف یہ کہ موضوع پر حجت کو تمام کرنے والی اور معترضین کو شافی جواب دینے والی ہے بلکہ تمام متلاشیانِ حق بالخصوص دعوت و اقامت دین کے عظیم مقصد کے لئے سرگرم مخلص مسلمانوں کے لئے بھی ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

(حافظ عاکف سعید)

امیر تنظیم اسلامی

التزام جماعت کا صحیح مفہوم

تحریر: مولانا گوہر رحمن

باعث تحریر

مدنیت اور اجتماعیت انسان کی طبیعت اور فطرت ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ شریعت کا حکم بھی یہی ہے کہ اجتماعی نظام قائم کیا جائے اور ایک عادل و صالح امیر کی امارت کے تحت زندگی گزاری جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے امیر کی اطاعت سے نکلنے کو جاہلیت قرار دیا ہے اور التزام جماعت کا حکم دیا ہے، لیکن تحقیق طلب بات یہ ہے کہ التزام جماعت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور ”الجماعۃ“ کی حقیقت کیا ہے؟ جس سے بالشت برابر علیحدگی بھی ایک مسلمان کو جاہلیت کے دائرے میں لے جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک نقطہ نظر تو یہ ہے کہ:

”جب ملت اسلامیہ اپنی سر زمین میں خود مختار ہو اور اس کا کوئی حکمران ہو تو ان کے اس عمل سے جو ریاست یا نظم سیاسی وجود میں آئے گا وہ ”الجماعۃ“ کہلائے گا۔ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک ہی نظم اجتماعی سے وابستہ ہوں۔..... حدیث کے اس مطلب کی روشنی میں جس کو ہم نے اوپر واضح کیا ہے، یہ حکم (التزام جماعت کا حکم) ہمارے ملک میں حکومت پاکستان کے ساتھ وفادار رہنے اور اس کے قوانین کی پابندی کرنے سے پورا ہو جاتا ہے اور ہم علی وجہ البصیرت یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت پاکستان ہی اس سر زمین کے مسلمانوں کے لیے الجماعۃ ہے۔“ (۱)

اس نقطہ نظر کے حاملین اس حکم شرعی کو تو جانتے اور مانتے ہیں کہ:

”حکمران بلا شرط مطاع نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہ شرط لگا دی کہ جب تک وہ قرآن و سنت پر عامل ہے اور شریعت اسلامیہ کو قانونِ بالا (سپریم لاء) تسلیم کرتا ہے اس وقت تک اس کی اطاعت کی جائے۔..... یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ کفر صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اسلام کے عقائد کا انکار کر دے، بلکہ حکمرانوں کے معاملے میں یہ بھی کفر ہے کہ وہ فصل نزاعات اور قانون سازی میں اللہ کی دی ہوئی شریعت کی خلاف ورزی کریں۔ اللہ کا فرمان ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ

هُمْ الْكُفْرُونَ (۴۴) هُمْ الظَّالِمُونَ (۴۵) هُمْ الْفٰسِقُونَ (۴۷) (المائدة)
 ”اور جو لوگ اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں جسے اللہ نے نازل کیا ہے وہی کافر ہیں..... وہی ظالم ہیں..... وہی فاسق ہیں۔“ (۱)

لیکن شریعت کے اس حکم کو جاننے اور ماننے کے باوجود اُن کا نقطہ نظر یہ بھی ہے جس کا اظہار جماعت اسلامی پاکستان کے سابق امیر جناب میاں طفیل محمد صاحب کے ایک تنقیدی خط کے جواب میں اس طرح کیا گیا ہے:

”شریعت کی رو سے تو کفر بواح کی مرتکب حکومت بھی اُس وقت تک الجماعۃ ہوتی ہے جب تک عامۃ الناس کا اعتماد اسے حاصل ہو اور مسلمان رعایا اس پر مجتمع ہو۔ اس کی اطاعت سے علیحدگی اور تخلف ممنوع ہے۔“

اس تضاد کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ:

”التزام جماعت کے حکم کی علت اور حکمت نفاذِ دین اور غلبہٴ دین نہیں ہے بلکہ اتفاق و اتحاد کا حصول اور افتراق و انتشار سے تحفظ التزام جماعت کی اصل علت ہے۔“ (ایضاً)

التزام جماعت کے مفہوم کے بارے میں ایک مکتب فکر تو یہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کی منتخب و معتمد حکومت الجماعۃ ہے، خواہ عادل و صالح ہو یا فاسق و فاجر ہو یا کھلے اور صریح کفر کی مرتکب ہو، جیسی بھی ہو، مگر جب تک اسے عامۃ الناس کا اعتماد حاصل ہے اس وقت تک اس کی اطاعت کرنا اور اس کا وفادار ہنا شریعت کا تقاضی ہے۔ باقی رہیں وہ تنظیمیں اور جماعتیں جو دعوتِ دین، غلبہٴ دین اور اقامتِ دین کے لیے بنائی جاتی ہیں وہ اس مکتب فکر کے نزدیک جائز تو ہیں مگر قرآن و سنت میں ایسی جماعتیں بنانے کے لیے نہ کوئی نص موجود ہے اور نہ کسی غیر حکومتی جماعت کے التزام و اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ سمع و طاعت سے متعلق تمام نصوص کا تعلق صرف حکومت وقت سے ہے جب کہ وہ عامۃ الناس کی معتمد ہو۔

التزام جماعت کے بارے میں دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ چونکہ حدیث صحیح میں جماعت المسلمین اور اس کے امام کے التزام کا حکم دیا گیا ہے اس لیے آج سے غالباً ۳۰ سال پہلے کراچی میں جو جماعت المسلمین بنائی گئی تھی اس میں شمولیت اختیار کر لی جائے اور دوسرے ناموں سے فرقے اور جماعتیں نہ بنائی جائیں۔ اس نقطہ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ حکومت پاکستان ”الجماعۃ“ ہے اور نہ دوسرے ناموں سے بنائی گئی تنظیمیں اور جماعتیں ”الجماعۃ“ ہیں

بلکہ ”الجماعۃ“ سے مراد جماعت المسلمین ہے۔ التزام جماعت کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ جماعت المسلمین اور اس کے امام کی اطاعت کی جائے۔

ان دو نقطہ ہائے نظر کے درمیان ایک عام مسلمان سخت الجھن کا شکار ہو سکتا ہے۔ میری اس تحریر کا مقصد کسی کے ساتھ مناظرہ کرنا نہیں ہے، بلکہ اپنے علم کی حد تک الجماعۃ اور التزام جماعت کے صحیح مفہوم کی تفتیح و تشریح کرنا ہے۔ کفر بواح کی مرتکب حکومت کے خلاف خروج اور مسلح بغاوت کا مسئلہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے، اس لیے اس موضوع پر فی الحال میں اپنی رائے پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا اور دینی سیاسی جماعتوں کے موضوع پر میرا ایک تفصیلی مقالہ میری کتاب ”تفہیم المسائل“ حصہ اول میں شامل ہے اور اس موضوع پر میرا ایک مضمون ”فاران“ میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر لکھنے کی اب ضرورت باقی نہیں رہی، کیونکہ میرا نقطہ نظر قارئین کے سامنے آچکا ہے۔

اس مضمون میں جن عنوانات پر بحث کی گئی ہے وہ درج ذیل ہیں:

- (۱) حکومت بالفعل اور حکومت بالحق۔
- (۲) اُمت مسلمہ کے وجود کا مقصد اقامتِ دین ہے۔
- (۳) اُمت مسلمہ کی نمائندہ حکومت کا مقصد بھی اقامتِ دین ہے۔
- (۴) الجماعۃ سے مراد وہ حکومت ہے جو اقامتِ دین کا کام کرتی ہو۔
- (۵) قرآن و سنت سے منحرف حکومت طاغوت ہے۔
- (۶) الجماعۃ بمعنی اہل سنت والجماعت۔
- (۷) جماعت المسلمین کا صحیح مفہوم۔
- (۸) دینی جماعتیں اہل سنت والجماعۃ کی برادر تنظیمیں ہیں۔

ان آٹھ موضوعات کے ذیلی عنوانات کے تحت اقامتِ دین کے مفہوم، اظہارِ دین کے مفہوم، افتراقِ اُمت کی حدیث کے مفہوم اور اہل سنت والجماعت کے مفہوم پر تفصیلی مباحث موجود ہیں۔ ان شاء اللہ ان مباحث کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد الجھن ختم ہو جائے گی اور التزام جماعت کا صحیح مفہوم معلوم ہو جائے گا۔

(۱) حکومت بالفعل اور حکومت بالحق

اصل موضوع پر بحث شروع کرنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری ہے جس کو

ملفوظ نہ رکھنے کی وجہ سے بعض سکالروں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ ایک حکومت تو وہ ہوتی ہے جو ایک امر واقعہ کے طور پر بالفعل قائم ہوتی ہے اور عملاً لوگ اس کو حکومت وقت کے طور پر تسلیم بھی کرتے ہیں اور اس کے انتظامی اور نظم و نسق سے متعلق قواعد و ضوابط کی پابندی بھی کرتے ہیں۔ مثلاً اس کی سڑکوں، ریلوے لائنوں اور ایئر لائنوں پر چلتے ہیں اور ٹریفک کے قواعد کی پابندی کرتے ہیں، اس سے اپنا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنواتے ہیں اور اس کو ٹیکس اور دوسرے سرکاری واجبات بھی ادا کرتے ہیں، بلکہ اپنے حقوق حاصل کرنے اور تنازعات کا تصفیہ کرانے کے لیے اس کی عدالتوں میں جانے پر بھی اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ ایسی حکومتیں تو آج امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان اور روس میں بھی عملاً قائم ہیں اور ان ممالک کے مسلمان شہری بھی ان کے ملکی قوانین کی پابندی کرتے ہیں اور مباحات کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ان حکومتوں کے انتظامی قواعد و ضوابط کی پابندی کرنا شرعاً ممنوع بھی نہیں ہے، لیکن کیا صرف بالفعل موجود ہونے اور حکومت وقت ہونے کی وجہ سے ان غیر مسلم حکومتوں کو الجماعہ کہا جاسکتا ہے جس کا التزام دین کا تقاضا ہے اور جس سے الگ ہونا جاہلیت ہے؟

ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان بھی ان حکومتوں کو الجماعہ نہیں کہہ سکتا۔ کیوں نہیں کہہ سکتا؟ اس لیے کہ یہ حکومتیں بالفعل تو ہیں مگر بالحق نہیں ہیں۔ قرآن و سنت کی رو سے بالحق حکومت وہ ہوتی ہے جو اللہ کی حاکمیت اور قرآن و سنت کی بالادستی کو نہ صرف یہ کہ اعتقاداً تسلیم کرتی ہو بلکہ عملاً حکومت کا پورا نظام قرآن و سنت کے مطابق چلاتی ہو، ورنہ وہ ظالم حکومت ہوگی اور ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ کے مصداق ظالموں کو حکومت کا حق نہیں ہے۔

اسی طرح پاکستان اور دوسرے بہت سے اسلامی ممالک کے اسی اور نسلی مسلمانوں کی حکومتیں بالفعل تو ہیں مگر بالحق حکومتیں نہیں ہیں، اس لیے کہ ان کے حکمران اسماء اور نسل مسلمان ہونے کے باوجود عملاً قرآن و سنت کی بالادستی بھی تسلیم نہیں کرتے اور شریعت اسلامی کا التزام بھی نہیں کرتے، بلکہ ملک کا نظام سیکولرزم اور لادین سیاست کے اصولوں کے مطابق چلاتے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ ان کو مسلمانوں نے منتخب کیا ہے تو جیسا کہ بعد کی سطور میں وضاحت کی جائے گی، قرآن و سنت کی بالادستی اور التزام سے عملاً منحرف ہو جانے والی حکومت کو بالحق حکومت نہیں کہا جاسکتا اگرچہ اس کو مسلمانوں نے منتخب کیا ہو اور اس کو عامۃ الناس کا اعتماد حاصل ہو۔ ﴿أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ

مسلمانوں نے اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے یا فریب خوردگی کی وجہ سے یا مفاد پرستی اور خود غرضی کی وجہ سے اگر قرآن و سنت سے منحرف حکومت کو منتخب کر لیا ہو تو وہ بھی حکومت بالحق ہو گی! بالفعل اور بالحق کے اس فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے اب اگلے عنوان پر غور کیجیے!

(۲) اُمت مسلمہ کے وجود کا مقصد اقامت دین ہے

اُمت مسلمہ وہ عالمی اور آفاقی جماعت ہے جو توحید و رسالت کے عقیدے کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ اس جماعت کی فکری قیادت رسالت محمدی یعنی قرآن و سنت کو تاقیامت حاصل ہے اور یہ پوری دنیا میں ایک ہی جماعت ہے۔ اور جو بھی اس جماعت سے باہر ہے وہ دائرۃ اسلام سے بھی خارج ہے، لہذا وہ جماعت جس کے التزام کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں رہ سکتا اور اس میں شمولیت کے بغیر دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا وہ تو ہے اُمت مسلمہ، لیکن سوال یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کی تشکیل اور اس کے وجود کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی جماعت مقصد اور ہدف کے تعین کے بغیر نہیں بنائی جاتی۔ اُمت مسلمہ خود اللہ نے بنائی ہے اور اس کی فکری قیادت و امارت رسالت محمدی کو دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت کا بے مقصد ہونا ناقابل تصور ہے۔ کسی جماعت کا مقصد وہی ہو سکتا ہے جو اس کو بنانے والے نے متعین کیا ہو اور اس جماعت کے ارکان کو اس مقصد کے حصول کے لیے کام کرنے کا حکم دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو جو حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ط﴾
(الشوری: ۱۳)

”مقرر کیا ہے اس نے تمہارے لیے وہ دین جس کی وصیت کی تھی اس نے نوح کو اور جس کی وحی کی ہے ہم نے تیری جانب اور جس کی وصیت کی تھی اس نے ابراہیم کو، موسیٰ کو اور عیسیٰ کو کہ قائم رکھو اس دین کو اور پھوٹ نہ ڈالو اس میں۔“

اس آیت میں لَكُمْ کے مخاطب مسلمان ہیں اور پوری اُمت مسلمہ ہے۔ ان کو مخاطب کر کے اللہ نے فرمایا ہے کہ تمہاری اس جماعت کا مقصد وجود وہی ہے جو انبیاء کا مقصد بعثت رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اقامت دین کا فرض ادا کرتے رہو اور دین کو قائم کرنے اور قائم رکھنے میں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ ہو، اختلاف نہ کرو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو، بلکہ سب

مل کر دین کی اس رسی کو مضبوطی سے تھام لو، اس لیے کہ یہ اقامت دین تمہاری جماعت کے وجود کا مقصد ہے اور اپنے وجود کے مقصد میں افتراق و اختلاف کرنا ایک غیر معقول رویہ ہے اور اپنا شیرازہ خود اپنے ہاتھوں سے منتشر کرنے کے مترادف ہے۔ امام ابن جریر (متوفی ۳۱۰ھ) لکھتے ہیں:

”ان سب انبیاء کو اللہ نے جو وصیت کی تھی وہ ایک ہی وصیت تھی اور وہ تھی اقامت دین کی وصیت۔“ (۱)

یہ بات تو کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے کہ اللہ نے اپنے انبیاء کو جو حکم دیا وہی حکم ان کی اُمتوں کے لیے بھی ہوتا ہے، الا یہ کہ اللہ نے صراحت کے ساتھ فرما دیا ہو کہ یہ حکم نبی کے لیے مخصوص ہے یا نبی نے کہہ دیا ہو کہ یہ حکم صرف میرے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کے بارے میں عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ:

اختارهم الله لصحبة نبيه ولاقامة دينه (۲)

”اللہ نے ان کو اپنے نبی کی رفاقت کے لیے اور اقامت دین کے لیے چن لیا تھا۔“
سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں اس اُمت وسط کا مشن ”شہادت حق“ قرار دیا گیا ہے، یعنی یہ کہ وہ اپنے قول و عمل سے حق کی گواہی دے گی اور اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کا عملی نمونہ پیش کرے گی۔ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۱۰ میں اس اُمت کی تشکیل کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بتایا گیا ہے، لیکن چونکہ حق اور معروف سے مراد دین حق کے فرائض ہیں اور منکر سے مراد منہیات اور سینات ہیں اس لیے نیکی کو پھیلانا اور برائی کو مٹانا دین حق کی شہادت دینا اور اقامت دین کا فرض انجام دینا ہے۔

اقامت دین کا مفہوم

شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۱۷۶ھ) نے ”اَقِمْوْا الدِّينَ“ کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے: ”قائم کنید دین را“ (دین کو قائم کرو) اور اس کی تشریح اپنی دوسری کتاب میں اس طرح کی ہے: ”آحضرت ﷺ جب ساری مخلوق کے لیے مبعوث ہوئے تو آپؐ نے لوگوں کے ساتھ مختلف معاملات کیے اور مختلف تدابیر اختیار فرمائیں، ہر معاملے کے لیے اپنے نمائندے اور نائب مقرر فرمائے اور ہر معاملے کو انجام دینے کے لیے بڑا اہتمام

فرمایا۔ اگر ہم ان سب معاملات کو معلوم کریں اور جزئیات سے کلیات معلوم کریں اور پھر کلیات سے ایسا واحد کلیہ معلوم کریں جو تمام کلیات کا جامع ہو تو وہ کلیہ اقامت دین ہی ہو سکتا ہے جو تمام کلیات پر مشتمل ہے اور اس کے تحت دین کے مختلف اجناس (شعبے) آتے ہیں۔“ (۱)

شاہ ولی اللہ کی درج بالا عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اُمت کی اصلاح کے لیے جو کام بھی کیے ہیں خواہ وہ اصول و کلیات سے تعلق رکھتے ہوں یا وہ فروع اور جزئیات سے متعلق ہوں، ان سب کا کلمہ جامعہ اقامت دین ہے۔ معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کے نزدیک اقامت دین سے مراد پورے کے پورے دین کو بمعہ اصول و فروع کے عملاً قائم کرنا ہے، نافذ کرنا ہے اور اس پر عمل درآ مد کروانا ہے، صرف پڑھنا پڑھانا اور خود عمل کرنا اقامت دین کا جامع مفہوم نہیں ہے۔

مولانا مودودیؒ (متوفی ۱۳۹۹ھ) نے ترجمہ تو کیا ہے: ”قائم کرو اس دین کو“ مگر تشریح میں لکھا ہے:

”اس فقرے کا ترجمہ شاہ ولی اللہ نے ”قائم کنید دین را“ کیا ہے اور شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے ”قائم رکھو دین کو“۔ یہ دونوں ترجمے درست ہیں۔ اقامت کے معنی قائم کرنے کے بھی ہیں اور قائم رکھنے کے بھی، اور انبیاء ان دونوں ہی کاموں پر مأمور تھے۔ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ دین قائم نہیں ہے وہاں اسے قائم کریں اور دوسرا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ قائم ہو جائے یا پہلے سے قائم ہو وہاں اسے قائم رکھیں۔ جو چیزیں مادی نہیں بلکہ معنوی ہوتی ہیں ان کے لیے جب قائم کرنے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد اس چیز کی محض تبلیغ کرنا نہیں بلکہ اس پر کما حقہ عمل درآ مد کرنا، اسے رواج دینا اور عملاً نافذ کرنا ہوتا ہے۔ انبیاء کو جب دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تھا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں اور دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں، بلکہ یہ بھی تھی کہ پورا دین ان میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے تاکہ اس کے مطابق عمل درآ مد ہونے لگے اور ہوتا رہے۔“ (۲)

(۱) ازالة الخفاء، طبع سہیل اکیڈمی لاہور، ص ۲۔

(۲) تفہیم القرآن، سورۃ الشوریٰ، حاشیہ ۲۰۔

(۱) جامع البيان عن تاويل آي القرآن، سورة الشورى، آیت ۱۳۔

(۲) مشکوٰۃ، کتاب الاعتصام، فصل ثالث۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے ترجمہ کیا ہے ”قائم رکھو اس دین کو“ اور تشریح اس طرح کی ہے کہ:

”قائم رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی جو باتیں ماننے کی ہیں وہ سچائی کے ساتھ مانی جائیں جو کرنے کی ہیں وہ دیانت اور راست بازی کے ساتھ کی جائیں نیز لوگوں کی برابر نگرانی رکھی جائے کہ وہ اس سے غافل اور منحرف نہ ہونے پائیں اور اس بات کا بھی پورا اہتمام کیا جائے کہ اہل بدعت اس میں کوئی رخ نہ پیدا کر سکیں۔“ (۱)

مولانا اصلاحی نے اقامت دین کی جو تشریح کی ہے اپنے حاصل مفہوم کے اعتبار سے وہی تشریح ہے جو شاہ ولی اللہ اور مولانا مودودی نے کی ہے کہ دین صرف عقائد و اخلاق کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں ماننے اور کرنے کی ساری چیزیں یعنی اصول و فروع اور جزئیات و کلیات سب شامل ہیں اور اس دین کو قائم رکھنے سے مراد خود بھی عمل کرنا ہے اور دوسروں سے بھی عمل کروانا ہے، لوگوں کو اس سے غافل اور منحرف ہونے سے بچانے کی کوشش کرنا بھی اقامت دین کے مفہوم میں شامل ہے اور دین کو اہل بدعت اور تجدد پسندوں کی رخ نہ انداز یوں سے محفوظ رکھنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

میں نے جب صحاح اللغات، لسان العرب، مفردات القرآن اور القاموس المحیط کی طرف اس مضمون کے لکھنے کے موقع پر ایک مرتبہ پھر مراجعت کی تو معلوم ہوا کہ ”قائم کرو“ کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے لیکن ائمہ لغت کی تصریحات اور عربی محاورات کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھنے والا ترجمہ ہے ”قائم رکھو اس دین کو“۔ قدیم مفسرین نے بھی اسی طرح کی تحقیق کی ہے اور جدید مفسرین کی غالب ترین اکثریت نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ لیکن قائم رکھنے کا مطلب بھی وہی ہے جو شاہ ولی اللہ، مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے بیان فرمایا ہے کہ پورے دین کو زندگی کا دستور العمل بناؤ۔ انفرادی زندگی سے تعلق رکھنے والے احکام کو بھی بالکل ٹھیک اور درست حالت میں برقرار رکھو اور دفاعی و جہادی یا عدالتی و معاشرتی شعبوں سے متعلق احکام کو قوانین کو بھی بالکل ٹھیک اور درست حالت میں برقرار رکھو اور ان پر کما حقہ عمل در آمد کرو۔

قدیم مفسرین میں امام ابوالحسن ماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) نے ”إِقِمْوُ الدِّينَ“ کی ہمہ پہلو تفسیر کی ہے۔ فرماتے ہیں:

(۱) تدبر قرآن، ج ۷، ص ۱۵۳۔

”اس دین پر عمل کرو اس کی طرف دعوت دیتے رہو اور اس کے دشمنوں کے مقابلے میں جہاد کرو۔“ (۱)

دین کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے خود عمل کرنا ضروری ہے، پھر دوسروں کو دعوت دینا اور جہاد کرنا بھی دین کو قائم رکھنے کا لازمی تقاضی ہے۔ مذکورہ بحث سے تو ثابت ہوتا ہے کہ اقامت دین نہ صرف یہ کہ ایک دینی فریضہ ہے بلکہ یہ تو حقیقت میں اُمّ الفرائض ہے، لیکن ہمارے ایک فاضل بھائی لکھتے ہیں:

”اس معنی (قائم رکھو) کی رو سے صاف واضح ہے کہ یہ دین کے فرائض میں سے ایک فرض اور اس کے احکام میں سے ایک حکم نہیں ہے کہ اسے فریضہ اقامت دین قرار دے کر فرائض دینی میں ایک فرض کا اضافہ کیا جائے، بلکہ یہ پورے دین کے متعلق ایک اصولی ہدایت ہے۔ ہر وہ چیز جو قرآن و سنت کی رو سے الدین میں شامل ہے آئے زیر بحث میں ہمیں اس کو اپنی زندگی میں برقرار رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے، لیکن اس لیے نہیں کہ یہ تمام یا ان میں سے کوئی حکم لفظ اَقِمْوُا کے مفہوم میں شامل ہے بلکہ اس وجہ سے کہ یہ سب الدین میں شامل ہیں۔“ (۲)

میں اس فاضل سے کہ لکھتا کہ فہم یا کج فہم تو نہیں سمجھتا کہ وہ اقامت دین کو ایک دینی فرض اور ایک دینی حکم اس لیے قرار نہیں دیتا کہ دینی فرائض و احکام الدین میں شامل ہیں، اَقِمْوُا کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں، حالانکہ بات قائم رکھنے اور عمل کرنے کی ہو رہی ہے تو کیا عمل کرنا، درست اور برقرار رکھنا بھی اَقِمْوُا کے مفہوم میں شامل نہیں ہے؟ یہ مفہوم تو آپ نے خود بیان فرمایا ہے!

اگر اس سچ کا کوئی سے کہ یہ کہے کہ پورے کے پورے اسلام پر عمل کرنا دینی فرض نہیں ہے، بلکہ اپنی طرف سے فرائض دینی میں ایک فرض کا اضافہ کرنا ہے، اس لیے کہ اسلام کے احکام اَدْخُلُوا کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں، یا کوئی دوسرا اٹھ کر یہ نکتہ آفرینی کرے کہ اللہ کی رسی کو مل کر تھامنا اور سارے مسلمانوں کا اس پر مجتمع ہونا دینی فرض نہیں ہے، اس لیے کہ ”حَبْلُ اللَّهِ“ ”وَاعْتَصِمُوا“ کے مفہوم میں شامل نہیں ہے، یا کوئی تیسرا شخص یہ کہہ دے کہ نماز تو دینی فرض ہے مگر اقامت صلوٰۃ دینی فرض نہیں ہے، اس لیے کہ نماز صلوٰۃ کے مفہوم میں تو

(۱) تفسیر الماوردی، طبع بیروت ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۷، ج ۵۔

(۲) برہان، طبع ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۔

شامل ہے مگر اقامت کے مفہوم میں شامل نہیں ہے، تو ایسے سکالروں اور عربیت کے ماہرین کے متعلق معلوم نہیں ہمارے اس فاضل دوست کی رائے کیا ہوگی۔ انہوں نے خود اَقِمْوُ الصَّلَاةَ اور وَاَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ کو اَقِمْوُ الدِّينَ کی مثال میں پیش فرمایا ہے۔ اگر اقامت صلوٰۃ اور اعتصام بحبل اللہ ان کے نزدیک فرض ہے، اور یقیناً فرض ہے، تو اقامت دین کیوں فرض نہیں ہے؟ مجھے تو ان تینوں میں سوائے جزء اور گل کے اور کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس علامہ کے دل و دماغ پر کسی کی غلطی ثابت کرنا اور علم و تحقیق کے اعتبار سے اسے نیچا دکھانا سوار ہو چکا تھا مگر بات بنتی نہیں تھی، اس لیے از خود بنانی پڑ گئی۔ واللہ اعلم!

اظہارِ دین کا مفہوم

یہ بات تو واضح ہوگئی کی اقامت دین انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہے اور اسی وجہ سے اُمت مسلمہ کے وجود کا مقصد بھی اقامت دین ہے، لیکن اس بات کی دوسری تعبیر یہ بھی ہے کہ اُمت مسلمہ کی تشکیل کا مقصد غلبہ دین کے لیے جہاد کرنا ہے، اس لیے کہ اس کے نبی کی نبوت کا مقصد اور حکمت غلبہ دین ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت و رسالت کی علت و حکمت درج ذیل آیات میں وضاحت و صراحت کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ نے متعین طور پر بتادی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ (التوبة: ۳۳، الصف: ۹)

”اللہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اسے ہر دین پر اگرچہ پسند نہ کرتے ہوں اسے مشرک۔“

الْهُدَى سے مراد ہے قرآن کریم۔ جیسا کہ دوسری جگہ آیا ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (البقرة: ۱۸۵)

”رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نازل ہوا تھا قرآن جو ہدایت ہے لوگوں کے لیے۔“

رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ہدایت ہے:

﴿وَأَنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (الشورى)

”اور یقیناً تو را ہنمائی کرتا ہے لوگوں کی سیدھی راہ کی جانب۔“

گویا الْهُدَى سے وحی خداوندی مراد ہے خواہ جلی ہو یا خفی، اور دین حق سے مراد ہے

زندگی کا سچا نظام، یعنی دین اسلام، اس لیے کہ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین تو حق ہو نہیں سکتا: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ ”بے شک اللہ کے نزدیک تو اللہ (یعنی دین حق) صرف اسلام ہے“۔ دِینُ الْحَقِّ کے معنی اللہ کا دین بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ الحق اللہ کا نام ہے اور سورۃ النصر میں اسلام کو ”دِینُ اللہ“ کہا بھی گیا ہے: ﴿وَرَأَيْتِ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِینِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا﴾ (۲) (اور دیکھ لیا ہے تم نے لوگوں کو کہ داخل ہو رہے ہیں اللہ کے دین میں گروہ درگروہ) مگر اس سیاق کلام میں یہ معنی متبادر نہیں ہیں، اس لیے کہ هُوَ الَّذِي میں جب اللہ کی ذات کا ذکر ہو گیا ہے تو اس کے بعد عربی مبین کے اسلوب کے مطابق ”وَدِينَهُ“ ہونا چاہیے تھا، نام کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں پر موصوف کی اضافت ہے اپنی صفت کی جانب اور ترکیب اضافی ترکیب توصیفی کے معنوں میں ہے، یعنی دین حق۔ اَلْهُدَى کے بعد دین حق کا ذکر اس حقیقت کے اظہار کے لیے کیا گیا ہے کہ قرآن و سنت میں صرف عقائد اور اخلاقی احکام کی تعلیم نہیں دی گئی بلکہ زندگی کا پورا نظام بتایا گیا ہے۔ اس کے معنی کہیں یہ نہ سمجھ لیے جائیں کہ دین حق کوئی الگ چیز ہے۔ نہیں! دین حق الْهُدَى یعنی قرآن و سنت کا دوسرا نام ہے۔

لِيُظْهِرَ میں لام تعلیل کا مفہوم یہ ہے کہ ہدایت اور دین حق کے ساتھ رسول بھیجنے کی علت و حکمت اور مقصد و ہدف اظہار دین ہے۔ ”اظہار“ باب افعال سے مصدر ہے جس کا ماخذ ہے ظہور، یعنی کھل جانا اور واضح ہو جانا، اور اظہار کے معنی ہیں ظاہر کرنا اور واضح کرنا، لیکن جب اَظْهَرَ يُظْهِرُ کے بعد علی کا حرف آجائے تو عربی اسلوب کلام میں اس کے دو معنی آتے ہیں: ایک اطلاع دینا اور کسی چیز پر مطلع کرنا، جیسے: ﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا﴾ (۲۶) إِلَّا مَن ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ کے معنی ہیں ”پس مطلع نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر کسی کو، مگر اُس رسول کو جسے اس نے پسند کر لیا ہو اور چن لیا ہو (غیب پر مطلع کرنے کے لیے)۔“ اور دوسرے معنی آتے ہیں غالب کرنا، بلند کرنا اور اونچا کرنا۔ سیاق کلام کے ساتھ یہی معنی مناسب ہیں اور قدیم و جدید مفسرین نے بھی لِيُظْهِرَهُ کی تفسیر کی ہے ”لِيُعْلِيَهُ“ یعنی تاکہ اس دین کو غالب اور بلند کر دے۔

سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف کی مذکورہ آیات سے قبل اسلام کے دشمنوں کی ان پھونکوں کا ذکر ہوا ہے جن سے وہ اپنے خیال میں اسلام کے نور کو بجھانا چاہتے تھے، اور اللہ کے اس وعدے کا ذکر بھی ہوا ہے کہ اپنے دین کی روشنی کو پورا کرے گا، اگرچہ کافروں کو ناگوار ہو اور

وہ پھونکیں مارتے رہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ نے اپنا رسول اظہارِ دین کے لیے بھیجا ہے تو اس سیاق کلام کے ساتھ اظہارِ دین بمعنی اعلاءِ دین ہی مناسبت رکھتا ہے، اظہارِ دین بمعنی اطلاعِ دین اس سیاق میں مناسبت اور معنویت نہیں رکھتا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کون غالب کرے گا اور کسے غالب کرے گا؟ قواعدِ عربیت کے اعتبار سے بھی اور سیاقِ کلام کے اعتبار سے بھی لُیْطْہَرُ کی ضمیر مرفوع مستترِ رسول کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اور معنی یہ بنتے ہیں کہ اللہ نے اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ رسول اس دینِ حق کو دوسرے ہر دین پر غالب کرے۔ اس پر سوال کیا جاسکتا ہے کہ غالب کرنا اللہ کے اختیار میں ہے، رسول کے اختیار اور قدرت میں تو نہیں ہے، لیکن یہی سوال تو اَقْبِمُوا الدِّینَ کے مفہوم پر اور ان سب آیات و احادیث کے مفہوم پر بھی کیا جاسکتا ہے جن میں افعال کی نسبت بندوں کی جانب کی گئی ہے یا جن میں بندوں کو کسی کام کا حکم دیا گیا ہے! ظاہر ہے کہ دین کو قائم کرنا اور قائم رکھنا تو اللہ کی قدرت میں ہے تو انبیاء کو اور ان کی اُمتوں کو کیوں حکم دیا گیا ہے کہ دین کو قائم رکھو؟ لیکن مراد یہ ہے کہ دین کو قائم رکھنے کی کوشش کرو، اہتمام کرو اور عزم کرو۔ جب تم ارادہ کرو گے اور کوشش کرو گے تو اللہ تمہیں توفیق دے دے گا۔ اسی طرح دین کو غالب اور بلند کرنے سے مراد ہے غالب کرنے کی کوشش کرنا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب نے غلبہٴ دین اور اعلاءِ دین کے لیے ہر ممکن جدوجہد بھی کی اور قتال بھی کیا اور اللہ کی توفیق سے انہوں نے اسلام کو پہلے مرحلے پر عرب میں اور پھر دوسرے مرحلے پر عجم پر بھی غالب کر دیا۔ بعد کے ادوار میں جب مسلمانوں میں خرابیاں پیدا ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان سے غلبہٴ دین اور غلبہٴ اہل دین کی نعت واپس لے لی، لیکن اُمت کا تاقیامت فرض وہی ہے جو ان کے رسول کا تھا اور وہ یہ ہے کہ اظہارِ دین اور اعلاءِ دین کے لیے جہاد کرتے رہو۔

حقیقت یہ ہے کہ دین غالب کرنے سے مراد غلبہٴ دین کے لیے جہاد کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ التوبہ سورۃ الفتح اور سورۃ الصف میں ﴿لُیْطْہَرُ عَلَی الدِّینِ کُلِّہٖ﴾ کا ذکر آیا ہے اور تینوں کا اصل موضوع جہاد و قتال ہے۔ سورۃ التوبہ میں اس آیت سے قبل مشرکین عرب اور اہل کتاب دونوں کے خلاف جہاد کا ذکر ہے اور سورۃ الفتح میں زیر بحث آیت سے قبل صلح حدیبیہ کا ذکر ہوا ہے جسے قرآن نے فتحِ مبین کہا ہے اور اس کے بعد مسجد حرام میں داخل ہونے اور فتح کی بشارت دی گئی ہے۔ اسی طرح سورۃ الصف میں بھی زیر بحث آیت کے بعد جہاد کی ترغیب دلائی گئی ہے اور فتحِ قریب کی بشارت دی گئی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ تینوں مقامات پر

آیہ زیر بحث کے سیاق و سباق سے ثابت ہوتا ہے کہ ﴿لُیْطْہَرُ عَلَی الدِّینِ کُلِّہٖ﴾ کا مطلب ہے ”تاکہ وہ رسول دینِ حق کو غالب کرنے کے لیے جہاد کرے“۔ جہاد و قتال کے معنی ہی یہ ہیں کہ اعلاءِ کلمۃ الحق اور اظہارِ دین کے لیے جدوجہد کی جائے اور جنگ لڑی جائے۔ لفظ لُیْطْہَرُ کی ضمیر مرفوع کا مرجع و سولہ کو قرار دینے کی ایک وجہ ترجیح یہ بھی ہے کہ یہ لفظ ضمیر کے زیادہ قریب ہے۔

مولانا مودودیؒ نے آیت کی یہی تشریح کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

”بعثت رسول ﷺ کی غرض اس آیت میں بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دینِ حق کو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے اسے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کر دے۔ دوسرے الفاظ میں رسول کی بعثت کبھی اس غرض کے لیے نہیں ہوئی کہ جو نظامِ زندگی لے کر وہ آیا ہے وہ کسی دوسرے نظامِ زندگی کا تابع اور اس سے مغلوب بن کر اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائش میں سمٹ کر رہے، بلکہ وہ بادشاہِ ارض و سما کا نمائندہ بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظامِ حق کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔“ (۱)

لیکن اکثر قدیم و جدید مفسرین نے آیت کی جو تفسیر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک لُیْطْہَرُ کی ضمیر مرفوع کا مرجع اللہ ہے اور ضمیر منصوب کا مرجع دینِ حق ہے، اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے اپنا رسول ﷺ ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ یعنی اللہ اپنے دین کو دوسرے ہر دین پر غالب کر دے۔ لیکن اس کا مطلب ظاہر ہے کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تکوینی اور غیبی قوت سے اس دین کو غالب کرے گا۔ اگر مطلب یہ ہوتا تو پھر رسول کا ذکر آیت میں نہ کیا جاتا، بلکہ یوں کہا جاتا کہ اللہ نے دینِ حق نازل کیا ہے تاکہ وہ اسے غالب کر دے۔ لیکن آیت میں غلبہٴ دین کا ذکر ارسالِ رسول کی حکمت اور علت کے طور پر کیا گیا ہے، جس کے معنی یہی ہیں کہ اللہ اپنے دین کو اپنے رسول کے جہاد کے نتیجے میں غالب کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث آیات کے سیاق و سباق میں جہاد و قتال کا ذکر ہوا ہے۔ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور اللہ تعالیٰ جو کام بھی کرتا ہے انہی اسباب کے پردے میں کرتا ہے۔ اسباب میں وہی تاخیر ڈالتا ہے اور انہیں نتیجہ خیز بنا دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ معجزے اور کرامت کے طور پر بعض اوقات اللہ تعالیٰ اسباب اور قانونِ فطرت (نیچر) سے بالا بالا اپنی تکوینی طاقت کے ذریعے بھی کام کرتا ہے اور کرتا رہا ہے، اس لیے کہ وہ تو اسباب اور نیچر کا

کی تعمیر قرآن مجید میں ہمیشہ مشرکین بنی اسماعیل ہی کے لیے اختیار کی جاتی ہے اس وجہ سے الدین کا الف لام عربیت کی رو سے لازماً عہد کے لیے ہے۔ چنانچہ تمام ادیان سے یہاں سرزمین عرب کے تمام ادیان مراد ہیں۔“ (ایضاً)

سردست تو میں ان کے اس ادعا کو نظر انداز کرتا ہوں کہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ قرآن میں الْمُشْرِکُونَ کا لفظ بنی اسماعیل ہی کے مشرکین کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، اور درج ذیل امور پر توجہ سے غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔

اظهارِ دین و اعلاءِ دین کو آیت میں ارسالِ رسول کی علت قرار دیا گیا ہے، یعنی اللہ نے اپنا رسول بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ دینِ حق کو غالب کرے۔ تو کیا اس نے اپنا یہ رسول صرف سرزمینِ عرب کے لیے بھیجا تھا یا پوری دنیا کے لیے بھیجا تھا؟ اس آیت میں تو اس بات کی تصریح کیا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے کہ دینِ حق صرف ادیانِ عرب پر غالب ہونے کے لیے آیا ہے، دنیا کے تمام ادیان پر غلبہ پانا اس دین کا اصل مقصد نہیں ہے۔ اس آیت کے سیاق و سباق اور قرآن کے نظائر سے تو صاف نظر آ رہا ہے کہ الدینِ کلہ میں الف لام جنس کے لیے ہے یا استغراق کے لیے ہے اور مراد دنیا کے سارے ادیانِ باطلہ ہیں، صرف عرب کے ادیان مراد نہیں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کشمکش کا آغاز سرزمینِ عرب پر ہوا تھا اور اسلام کو پہلے مرحلے پر غلبہ بھی سرزمینِ عرب میں حاصل ہوا تھا۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ”وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ“ میں بنو اسماعیل ہی کے مشرکین مراد ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو دین حق کا غلبہ کیوں ناگوار تھا؟ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اس دین کا بنیادی عقیدہ تو حید ہے جو مشرکین پر سخت ناگوار گزرتا ہے خواہ عرب کے مشرکین ہوں یا عجم کے۔ مشرک جہاں بھی ہو تو حید کا غلبہ اسے سخت ناگوار ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الشوریٰ میں اقامت دین کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ:

﴿كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ﴾ یعنی ”بڑا ناگوار ہے مشرکین پر وہ دین جس کی طرف تو اُن کو بلاتا ہے“۔ بہر حال لفظ الْمُشْرِكُونَ کو اس دعوے کا قرینہ اور دلیل قرار دینا کہ الدین کلّہ سے عرب ہی کے ادیان مراد ہیں، محض تکلف اور تضغ ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ سرزمین عرب میں دین حق کو غلبہ کیا جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا یا اللہ نے اپنی تکوینی قوت سے غالب کیا تھا اور رسول و اصحاب رسول کی جدوجہد کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا؟ اگر اللہ نے جدوجہد کے نتیجے میں دین کو غلبہ دیا تھا تو پھر کیا رسول ﷺ

(۱) برهان، ص ۱۲، ۳۱۔

اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی جدوجہد اُمت مسلمہ کے لیے اُسوۂ حسنہ نہیں ہے؟ اگر ہے، اور یقیناً ہے، تو پھر آپ کی اس بات کی کیا توجیہ ہے کہ یہ حکم نبی اور صحابہ کے ساتھ مخصوص ہے اور اب قیامت تک کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس آیت کے حکم کا کوئی تعلق اپنی جدوجہد کے ساتھ قائم کرے؟ مع ناطقہ سر بگرمیاں ہے اسے کیا کہیے؟

جوابات صحیح ہے وہ صرف اتنی ہے کہ رسول اور اس کے رفقاء کی جدوجہد کے نتیجے میں اللہ نے عرب میں اسلام غالب کیا تھا تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پاکستان میں بھی کسی جدوجہد کے نتیجے میں اسلام ضرور غالب ہوگا۔ جدوجہد فرض ہے اور اس کا ماخذ یہ آیت بھی ہے۔

(۳) اُمت مسلمہ کی نمائندہ حکومت کا مقصد بھی اقامت دین ہے

اُمت مسلمہ کے وجود کا مقصد تو متعین ہو گیا کہ شہادت حق، بھلائی کا پھیلانا، برائی کا مٹانا، اظہارِ دین و اعلاءِ دین کے لیے جدوجہد کرنا اور اقامتِ دین کا فریضہ جامعہ ادا کرنا اس عالمی اسلامی جماعت کا فرض منصبی اور مقصد وجود ہے، اس لیے کہ اس کے قائد محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصد بعثت یہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اُمت کی منتخب کردہ اور اس کی نمائندگی کرنے والی حکومت کی تشکیل کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس کا مقصد صرف امن و امان قائم کرنا، ریاست کے شہریوں کو متحد رکھنا، ان کو سہولتیں بہم پہنچانا، ان کی زندگی کے معیار کو بلند کرنا اور ملک کا دفاع کرنا ہے یا اُس کا اصل فریضہ کچھ اور ہے جو اُس کو دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتا ہے؟

اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے، اس لیے کہ اسلامی حکومت اُمت مسلمہ کی وکالت اور نمائندگی کرتی ہے تو جو مقصد اُمت کا ہے وہی مقصد اسلامی حکومت کا بھی ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں اقامتِ دین کا جو حکم انبیاء اور اُمت مسلمہ کو دیا گیا ہے انبیاء کی خلافت اور اُمت مسلمہ کی وکالت کرنے والی اسلامی حکومت کا مقصد وجود بھی یہی اقامتِ دین ہے جو ایک فریضہ جامعہ ہے۔ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۱۰ میں اس بہترین اُمت کے برپا کرنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ معروف کا حکم دے گی اور منکر سے روکے گی۔ اسلامی حکومت کا بھی یہی فرض منصبی ہے جو اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا

بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿۴۱﴾ (الحج)
”یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر قوت و اقتدار دے دیں ہم اُن کو زمین میں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے، اور اللہ ہی کے لیے ہے انجام تمام کاموں کا۔“

اس آیت سے مصللاً قبل دو آیتوں ۳۹، اور ۴۰ میں قتال کی اجازت دی گئی ہے جو دو ورگی میں نہیں تھی، اور قتال کا یہ مقصد بتایا گیا ہے کہ ظلم و فساد کا مٹانا اور عدل و صلاح کا نظام قائم کرنا قتال فی سبیل اللہ کا اصل مقصد ہے۔ اور اس کے بعد درج بالا آیت نمبر ۴۱ میں قتال کے نتیجے میں جو حکومت بنے گی اس کے منشور کا چار نکاتی پروگرام بیان کیا گیا ہے، یعنی اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

ان تین آیات کو ملا کر پڑھنے سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جہاد و قتال کا مقصد لوگوں کو جبر و اکراہ کے ذریعے مسلمان بنانا نہیں ہے، بلکہ ظلم و فساد کے نظام کو مٹانا اور عدل و انصاف کا نظام قائم کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ اسلامی حکومت جہاد و قتال کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ اور تیسری بات یہ واضح ہو گئی کہ اسلامی حکومت کا مقصد وجود اقامتِ دین ہے، اس لیے کہ درج بالا آیت میں جو فرائض اربعہ بیان ہوئے ہیں وہ اقامتِ دین کے فریضہ جامعہ میں شامل ہیں اور اس کلیہ واحدہ کی جزئیات ہیں۔

اسلامی حکومت کا یہی مقصد رسول اللہ ﷺ نے بھی وضاحت و صراحت کے ساتھ متعین کر دیا ہے:

((إِنَّ هَذَا الْأَمْرَ فِي قُرَيْشٍ لَا يُعَادِيهِمْ أَحَدٌ إِلَّا كَبَّهَ اللَّهُ فِي النَّارِ عَلَى وَجْهِهِ مَا أَقَامُوا الدِّينَ))^(۱)

”یہ اقتدار قریش میں رہے گا، جو بھی اس بارے میں ان سے دشمنی کرے گا تو اس کو اللہ اوندھے منہ آگ میں ڈال دے گا، جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھیں گے۔“
قریش کو چونکہ جاہلیت میں بھی اور اسلام میں بھی لوگوں کا زیادہ اعتماد حاصل تھا اور حکومت مسلمانوں کی اسی جماعت کو دی جاسکتی ہے جس کو اکثریت کا اعتماد حاصل ہو، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرما دیا کہ امامت و قیادت قریش میں رہے گی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب و کتاب الاحکام۔

دین کو قائم رکھیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عامۃ الناس کی معتمد و منتخب حکومت بھی اگر اقامت دین کا فرض ادا نہ کرے تو شرعاً وہ حکومت بالحق نہیں ہوگی اور اس کو برسر اقتدار رہنے کا کوئی دینی استحقاق حاصل نہیں ہوگا۔ حافظ ابن حجرؒ نے ”مَا أَقَامُوا الدِّينَ“ کی تشریح اس طرح کی ہے: ای مدۃ اقامتہم امور الدین (یعنی ان کو حکومت کرنے کا حق اُسی وقت تک حاصل رہے گا جب تک کہ وہ دینی امور کو قائم رکھیں گے۔)

مسند احمد میں انس بن مالکؓ اور ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ہم ایک انصاری کے گھر میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور دروازے پر کھڑے ہو کر فرمایا:

((الْأَيْمَةُ مِنْ قُرَيْشٍ إِنْ لَهُمْ عَلَيْكُمْ مَا إِنْ اسْتَرْحِمُوا فَرَحِمُوا وَإِنْ عَاهَدُوا أَوْفُوا وَإِنْ حَكَمُوا عَدَلُوا فَمَنْ لَمْ يَفْعَلْ ذَلِكَ مِنْهُمْ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ)) (۱)

”امراء قریش میں سے ہوں گے۔ ان کا تم پر اطاعت کا حق ہے بشرطیکہ جب اُن سے رحم طلب کیا جائے تو وہ رحم کریں، جب وہ وعدہ کریں تو اسے پورا کریں اور جب وہ فیصلہ کریں تو عدل و انصاف سے کریں۔ اور ان میں سے جو ایسا نہیں کرے گا تو اس پر اللہ، اس کے فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہوگی۔“

ظاہر بات ہے کہ لعنتی امیر اللہ کے عذاب کے طور پر بالفعل امیر تو ہو سکتا ہے مگر بالحق امیر نہیں ہو سکتا کہ اسے الجماعۃ کہا جاسکے اور اس کی اطاعت و وفاداری کو التزام جماعت کا صحیح مفہوم قرار دیا جاسکے۔

حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اسْتَقِيمُوا الْقُرَيْشَ مَا اسْتَقَامُوا إِلَيْكُمْ فَإِذَا لَمْ يَفْعَلُوا فَصَعُوا سِوْفَكُمْ عَلَى عَوَاتِقِكُمْ فَإِيْدُوا خَضِرَاءَ هُمْ فَإِذَا لَمْ تَفْعَلُوا فَكُونُوا زَارِ عَيْنِ أَشْقِيَاءَ تَأْكُلُوا مِنْ كَدِّ أَيْدِيكُمْ)) (۲)

”تم قریش کی اطاعت پر قائم رہو جب تک کہ وہ تمہارے لیے حق پر قائم رہیں۔ جب وہ ایسا نہ کریں تو پھر تم اپنی تلواریں کا ندھوں پر رکھو اور اُن کے سر برد آورہ

لیڈروں کو ہلاک کر دو اور جب تم ایسا نہ کر سکو تو بد نصیب کا شکار بن جاؤ اور اپنے ہاتھوں کی محنت سے کما کر کھاؤ۔“

یعنی اگر تم اس نا اہل حکومت کا تختہ الٹنے کی طاقت نہ رکھتے ہو یا باوجود طاقت کے یہ کام کرنا نہ چاہتے ہو تو پھر ذلت اور بد نصیبی کی زندگی گزارو اور اپنے دن پورے کرو۔ حافظ نور الدین ہیشمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے راوی سب کے سب ثقہ ہیں۔ (۱)

البتہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں انقطاع ہے، اس لیے کہ سالم بن ابی الجعد کا سماع ثوبانؓ سے ثابت نہیں ہے، لیکن اسی مضمون کی حدیث طبرانی نے نعمان بن بشیرؓ سے بھی نقل کی ہے۔ (۲)

یہ حدیث مسند احمد میں بھی نقل ہوئی ہے لیکن تلواریں اٹھانے والا حصہ اس میں موجود نہیں۔ (۳) حافظ ابن حجر نے ابن اسحاق (متوفی ۱۵۰ھ) سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے سقیفہ بنو ساعدہ کی مجلس میں فرمایا تھا:

إِنَّ هَذَا الْأَمْرَ فِي قُرَيْشٍ مَا أَطَاعُوا اللَّهَ وَاسْتَقَامُوا عَلَى أَمْرِهِ (۴)

”حکومت قریش میں رہے گی جب تک کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں اور اس کے دین پر قائم رہیں۔“

مذکورہ دلائل سے یہ بات بغیر کسی ابہام و اشتباہ کے واضح ہوگئی کہ اُمت مسلمہ کی نمائندہ حکومت کا مقصد وہی ہے جو اُمت کا مقصد وجود ہے اور جو محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصد بعثت ہے اور وہ ہے اقامت دین۔ چونکہ اسلامی حکومت یہی فرض انجام دیتی ہے، اس لیے اس کا اصطلاحی نام خلافت ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے خلافت کی تعریف اور اس کے فرائض منضی اس طرح بیان کیے ہیں:

”خلافت وہ عمومی ریاست ہے جو اقامت دین کے لیے عملاً متوجہ رہتی ہو (اور دین کو قائم رکھنے کے لیے) دینی علوم کی اشاعت اور احیاء کا فرض انجام دیتی ہو ارکان

(۱) مجمع الزوائد، ص ۱۹۵، ج ۵۔

(۲) فتح الباری، کتاب الاحکام، ص ۲۳۴، ج ۱۶۔

(۳) الفتح الربانی، ص ۲۷۶، ج ۲۳۔

(۴) فتح الباری، ص ۳۳۲، ج ۱۶۔

(۱) الفتح الربانی، ص ۷۶، ج ۲۳۔

(۲) المعجم الصغير للطبرانی بتحقيق محمد شكور، ص ۱۳۴، ج ۱۔

اسلام (نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) کو قائم رکھتی ہو، جہاد اور اس سے متعلقہ امور کے لیے کمر بستہ اور تیار رہتی ہو، مثلاً فوجوں کو منظم رکھنا، ان کو تنخواہیں دینا اور مالِ فتنے میں ان کی اعانت کرنا، عدالتی نظام قائم رکھتی ہو، شرعی سزائیں قائم کرتی ہو، مظالم کا خاتمہ کرتی ہو، نیکی کا حکم دیتی ہو اور برائی سے روکتی ہو اور یہ سارے فرائض ریاست وہ نبی ﷺ کی نیابت کے طور پر انجام دیتی ہو۔^(۱)

شاہ صاحبؒ نے جو آٹھ فرائض بیان کیے ہیں یہ بھی کلیات ہیں جن کے تحت بہت سی جزئیات ہیں، لیکن ان کلیات ثمانیہ اور دوسرے فرائض پر مشتمل کلیہ واحدہ اور فریضہ جامعہ اقامت دین ہے۔ شاہ صاحبؒ آگے فرماتے ہیں کہ مذکورہ سارے فرائض اصل میں فرائض نبوت ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے بڑے احسن اور مکمل طریقے سے انجام دیے تھے، لیکن آپ کے انتقال کے بعد بھی اقامت دین مذکورہ تفصیل کے ساتھ واجب ہے اور اقامت دین موقوف ہے ایسے شخص کے تقرر پر جو اس کام کا اہتمام و انتظام کرے۔ بس یہی شخص خلیفہ اور امیر ہوتا ہے۔^(۲) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (متوفی ۷۲۸ھ) نے بھی فرمایا ہے کہ اسلامی حکومت کے بغیر دین کو قائم اور برقرار نہیں رکھا جاسکتا: بل لا قیام للدين الا بها۔^(۳)

سورۃ النور کی آیت نمبر ۵۵ جس کو آیت خلافت کہا جاتا ہے اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ خلافت یعنی اسلامی حکومت اللہ کی نعمت ہے جس کے ذریعے دین اسلام کو ممکن اور مضبوطی حاصل ہوتی ہے، امن و امان قائم ہوتا ہے اور اندرونی و بیرونی دشمنوں کے حملوں کا خوف و خطرہ باقی نہیں رہتا۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس خلافت کے نظام میں لوگ اللہ ہی کی بندگی کرتے ہیں اور مشرک نہ نظام ختم ہو جاتا ہے۔ یہی خلافت اور اسلامی حکومت الجماعہ ہے جو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے جس کی اطاعت و وفاداری اور جس کا التزام دین کا حکم ہے، جس سے الگ ہونا جاہلیت ہے اور اسلام کا قلاہ گردن سے اتارنا ہے۔

(۴) الجماعۃ سے مراد وہ حکومت ہے جو اقامت دین کا فرض انجام دیتی ہو

مذکورہ عنوانات کے تحت جو بحث کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کا مقصد وجود بھی اقامت دین ہے اور اس اُمت کی معتمد و منتخب حکومت کا مقصد وجود بھی اقامت دین

(۱) ازالة الخفاء، ص ۲۔ (۲) ازالة الخفاء، ص ۳۔

(۳) السياسة الشرعية، ص ۱۷۲، ۱۷۳۔

ہے۔ اس بحث سے یہ بات بھی از خود ایک منطقی نتیجے کے طور پر سامنے آگئی ہے کہ الجماعۃ سے مراد مطلقاً کوئی حکومت نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ حکومت ہے جو اقامت دین کا فرض انجام دیتی ہو۔ اور التزام جماعت کا صحیح مفہوم اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے، لیکن اگر اسلامی حکومت موجود ہی نہ ہو تو پھر اس کے لیے منظم اور اجتماعی جدوجہد کرنا ایک دینی فریضہ ہے۔ اور جو جماعتیں اسلامی حکومت برائے اقامت دین کے لیے دین و شریعت اور سنت رسول و سنت اصحاب رسول کے اصول و ہدایت کے مطابق کام کر رہی ہوں ان میں سے جس پر زیادہ اعتماد ہو اس میں شمولیت اختیار کرنا اور اس کے نظم کا التزام کرنا جدوجہد برائے غلبہ دین و اقامت دین کا لازمی تقاضا ہے۔

بعض سکالر جو یہ کہتے ہیں کہ کفر بواج کی مرتکب حکومت بھی اُس وقت تک الجماعۃ ہوتی ہے جب تک کہ اسے عامۃ الناس کا اعتماد حاصل ہو اور مسلمان رعایا اُس پر مجتمع ہو، اور اس کے قوانین کی اطاعت و وفاداری التزام جماعت ہے، اگرچہ وہ عملاً قرآن و سنت کی بالادستی سے مخرف ہو چکی ہو اور ملک کا نظام سیکولر ازم کے اصولوں کے مطابق چلا رہی ہو، ان سکالروں سے میری درد مندانہ اپیل ہے کہ وہ اپنی رائے پر نظر ثانی کریں۔ ”الجماعۃ“ کا اطلاق آخر اس حکومت پر کیسے ہو سکتا ہے جو قرآن و سنت کی بالادستی کو عملاً تسلیم نہ کرتی ہو، فیصلے مآ انزل اللہ کے خلاف کرتی ہو، بھلائی کے کاموں کے راستے میں روڑے اٹکا رہی ہو اور برائی کو فروغ دے رہی ہو، حدود اللہ اور شعائر اللہ کا مذاق اڑا رہی ہو اور اسلام کی دشمن طاغوتی قوتوں کی آلہ کار بنی ہوئی ہو؟ میری رائے تو یہ ہے کہ ایسی حکومت کو الجماعۃ کہنا اس دینی اور شرعی اصطلاح کی توہین ہے، ایک سیکولر حکومت کو دینی جواز فراہم کرنا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اس کو مسلمانوں نے منتخب کیا ہے تو مسلمانوں نے اگر دھوکے اور فریب میں آکر یا مفاد پرستی اور خود غرضی کی وجہ سے یا اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایسے لوگوں کو منتخب کر لیا ہو جو اقامت دین کا فریضہ انجام دینے کی بجائے طاغوتی اور غیر اسلامی نظام چلا رہے ہوں تو صرف اکثریت کا ووٹ حاصل کرنے سے تو طاغوت کو الجماعۃ نہیں کہا جاسکتا۔ اسلام کے سیاسی نظام میں اسلامی حکومت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کی معتمد ہو اور مسلمانوں کی رائے سے بنی ہو، اور یہ بھی لازمی شرط ہے کہ وہ اسلام کے معیارِ اہلیت کی کم از کم شرائط پر پوری اترتی ہو اور ریاست کا نظام قرآن و سنت کے مطابق چلاتی

ہو۔ اصل معیاری صورت تو یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ بھی علم و عمل کے اعتبار سے اپنے دور میں ایک ممتاز مسلمان ہو۔ لیکن اگر شخصی کردار و عمل کے لحاظ سے اس کے اندر کچھ خرابیاں اور کمزوریاں موجود ہوں مگر جب تک ریاست کا نظام شریعت کے مطابق چلا رہا ہو تو شخصی خرابیوں کے باوجود اس کی حکومت اسلامی حکومت ہوگی اور اس کی اطاعت فی المعروف شرعاً ضروری ہوگی، البتہ حکمران کی شخصی خرابیوں کے ازالے اور اصلاح کے لیے نقد و احتساب اور نصیحت کا فرض ادا کرنا بھی ضروری ہوگا۔

سمع و طاعت اور التزام جماعت کے بارے میں قرآن و سنت کی نصوص کا تعلق اسلامی حکومت سے ہے، سیکولر حکومت کے ساتھ ان نصوص کا کوئی تعلق نہیں ہے، خواہ جمہوری ہو یا آمرانہ۔

عَنْ أُمِّ الْحَصِينِ أَنَّهَا سَمِعَتْ النَّبِيَّ ﷺ يَخْطُبُ فِي حَجَّةِ الْوُدَاعِ وَهُوَ يَقُولُ: ((وَلَوْ اسْتَعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ يَقُودُكُمْ بِكِتَابِ اللَّهِ فَاسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوا))^(۱) وَفِي رِوَايَةٍ: ((مَا أَقَامَ فِيكُمْ كِتَابَ اللَّهِ))^(۲)

”اُمّ الحصین سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ حجۃ الوداع کے دوران اپنے خطاب میں فرما رہے تھے: ”اگر تم پر ایک غلام بھی امیر بنا دیا گیا ہو جو تمہاری قیادت اور امارت اللہ کی کتاب کے مطابق کر رہا ہو تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔“ دوسری روایت میں آیا ہے کہ: ”جب تک کہ تمہارے درمیان اللہ کی کتاب قائم رکھتا ہو۔“

التزام جماعت اور سمع و طاعت کے بارے میں یہ رسول اللہ ﷺ کی آخری ہدایت ہے جو آپ نے اپنی اُمت کو دی ہے۔ اس ہدایت میں دو باتوں کی تاکید کی گئی ہے ایک یہ کہ اجتماعی نظام قائم رکھو اگر امیر تم کو طبعاً پسند نہ بھی ہو مثلاً وہ غلام ہو پھر بھی اس کی اطاعت کرو تاکہ مسلمانوں کی جماعت میں انتشار پیدا نہ ہو اور اُمت کی وحدت برقرار رہے اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ حکومت کا نظام قرآن کے مطابق چلا رہا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حکومت قرآن و سنت کی بالادستی تسلیم نہیں کرتی اور ملک کا نظام لادین سیاست کے اصولوں کے مطابق چلا رہی ہے تو درج بالا حدیث کا اور اس مضمون کی دوسری احادیث کا ایسی حکومت

(۱) صحیح البخاری، کتاب الامارات۔

(۲) الفتح الربانی، ص ۴۴، ج ۲۳۔

کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاذ بن جبل نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر ہم پر ایسے حکمران مسلط ہو گئے جو نہ آپؐ کی سنت کی پیروی کرتے ہوں اور نہ آپؐ کے حکم پر عمل کرتے ہوں تو ایسے حکمرانوں کے بارے میں آپؐ کا حکم کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: لَا طَاعَةَ لِمَنْ كَمْ يُطِيعُ اللَّهَ^(۱)

”جو اللہ کی اطاعت نہیں کرتا اس کی کوئی اطاعت نہیں (تم بھی اس کی اطاعت نہ کرو)۔“

بخاری و مسلم کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی“۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ: ”جو امیر حق کے مطابق حکم دیتا ہے اور وہ عادل بھی ہے تو وہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقرر کردہ امیر کی طرح ہے، اس لیے کہ وہ شارع کے حکم اور ان کی شریعت کے مطابق امیر بناتا ہے۔“^(۲)

یعنی جب حکمران نبی ﷺ کی نیابت میں کام کرتا ہے تو اس کی اطاعت منوب عنہ کی اطاعت ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی“۔ لیکن جب حکمران قرآن و سنت کی بالادستی تسلیم نہیں کرتا اور شریعت محمدیؐ سے آزاد ہو کر حکومت کر رہا ہے تو اس کی اطاعت آخر کس بنیاد پر بنی کریم ﷺ کی اطاعت سمجھی جائے گی؟

یہ درست ہے کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ امیر تمہیں پسند ہو یا ناپسند، اس کا حکم تمہاری رائے یا طبیعت و مزاج کے مطابق ہو یا نہ ہو وہ اگر تم پر دوسروں کو ترجیح دے رہا ہو یا تمہارے حقوق ادا نہ کر رہا ہو جیسی بھی صورت حال ہو تم اس کی اطاعت کرو اور مسلمانوں کی اجتماعت کو نقصان نہ پہنچو۔ لیکن ایک تو ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلح بغاوت نہ کرو بلکہ دوسرے ذرائع سے ایسے امیر کی اصلاح یا پھر اس کو بدلنے کے لیے کوشش کرو۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ احادیث اس حکومت کے بارے میں ہیں جو ملک کا نظام شریعت کے مطابق چلا رہی ہو اور اس کی ریاست میں قرآن و سنت کی بالادستی عملاً تسلیم کی جاتی ہو۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس مضمون کی احادیث کا تعلق ذاتی اور شخصی حقوق سے ہے اور

(۱) فتح الباری، کتاب الاحکام، ص ۲۲۸، ج ۱۶۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب الفتن۔

مطلب یہ ہے کہ اگر حکمران تم پر ذاتی طور پر ظلم بھی کر رہا ہو مگر جب ملک میں شریعت نافذ ہے تو تم صبر کرو اور اجتماعیت کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ آخر ان احادیث کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے کہ شریعت سے باغی اور منحرف سیکولر حکومت بھی الجماعۃ ہے اور اس جماعت کا التزام تقاضائے شریعت ہے؟

یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ ایک ہی موضوع سے تعلق رکھنے والی احادیث ایک دوسری کی تشریح کرتی ہیں۔ اس قاعدے کی رو سے وہ تمام احادیث جن میں اطاعت امیر کے لیے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ وہ اقامت دین کا کام کر رہا ہو اور شریعت کی بالادستی کو عملاً تسلیم کرتا ہو ان تمام احادیث کی تشریح کرتی ہیں جن میں یہ قید موجود نہیں ہے۔ مثلاً ابن عباسؓ کی روایت میں آیا کہ: ”جو شخص سلطان کی اطاعت سے بالشت برابر بھی باہر نکلا ہو تو وہ جاہلیت کی موت

مرے گا۔“ (۱)

اور دوسری حدیث میں آیا ہے کہ:

”جو شخص الجماعۃ سے بالشت برابر بھی الگ ہوا تو اس کی موت جاہلیت پر ہوگی۔“ (۲)

تو دوسری آیات و احادیث کی روشنی میں جب ہم غور کرتے ہیں تو ان دونوں حدیثوں کا مفہوم ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت سے باہر نکلنا اور اسلامی حکومت پر مجتمع ہونے والے مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہونا جاہلیت ہے، اور وہ بھی اس صورت میں جب اس کے خلاف مسلح بغاوت کی جائے۔ جیسا کہ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ”خروج من السلطان“، کنایہ ہے جنگ کرنے سے۔ (۳)

لیکن اگر دوسری احادیث سے صرف نظر کر کے ان دو احادیث پر غور کیا جائے تو سلطان سے مطلق حکومت مراد لے لی جائے گی خواہ وہ کفر بواج کی مرتکب ہو یا فسق کی مرتکب ہو یا وہ عادل حکومت ہو۔

(۵) قرآن و سنت کے التزام سے منحرف حکومت الجماعۃ نہیں بلکہ طاعوت ہے

جو حکومت قرآن و سنت سے منحرف ہو اور اس کی مقننہ عدلیہ اور انتظامیہ تینوں شریعت کی برتری اور بالادستی کا التزام نہ کرتے ہوں تو ایسی حکومت کو طاعوت کہا جاتا ہے جس کے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الفتن۔ (۲) صحیح البخاری، کتاب الفتن۔

(۳) فتح الباری، ص ۱۱۲، ج ۱۲۔

بارے میں حکم خداوندی ہے کہ: ﴿وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ (النحل: ۳۶) ”طاغوت سے الگ ہو جاؤ۔“ تو وہ الجماعۃ کیسے ہو سکتی ہے جس کے بارے میں حکم رسولؐ یہ ہے کہ: ﴿عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ﴾ ”جماعت کا التزام کرو۔“ آخر ایک ہی حکومت سے اجتناب اور اس کا التزام دونوں کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ اللہ نے جب طاعوت سے اجتناب کرنے والوں کو خوشخبری سنائی ہے (الزمر: ۱۷) تو اس کا رسول طاعوت کے التزام کا حکم کیسے دے سکتا ہے؟ جب کلام اللہ میں طاعوت کی اطاعت کرنے والوں کو لعنتی شیطان کے ساتھی اور بدترین لوگ قرار دیا گیا ہے (النساء: ۵۱، ۵۲، ۷۶ اور المائدہ: ۶۰) تو کلام الرسول میں یہ حکم کیسے دیا جاسکتا ہے کہ اس کا التزام کرو اور اسی کے ساتھ چمپے رہو! طاعوت کے پاس اپنے تنازعات اور معاملات فیصلہ کرانے کے لیے لے جانا تو منافقت اور ضلالت ہے۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے:

﴿الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا نُزِّلَ إِلَيْكَ وَمَا نُزِّلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ط وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ (النساء)

”کیا تو نے دیکھا نہیں ہے ان لوگوں کو جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو اتاری گئی ہے تیرے پاس اور ان کتابوں پر بھی جو اتاری گئی تھیں تجھ سے پہلے، مگر چاہتے ہیں کہ اپنے تنازعات فیصلہ کرانے کے لیے لے جائیں طاعوت کے پاس حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ طاعوت کی اطاعت سے انکار کریں اور شیطان تو چاہتا ہے کہ ان کو بھٹکا کر حق سے دور لے جائے۔“

اس آیت میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب کو چھوڑ کر طاعوت کے پاس اپنے تنازعات اور معاملات لے جانا منافقت ہے اور ضلال بعید ہے۔ تو آخر کیسے ممکن ہے کہ اللہ کا رسول طاعوت کو الجماعۃ کے مفہوم میں شامل کر لے، اس کے التزام کا حکم دے اور اس سے الگ ہونے کو جاہلیت اور اسلام کا قلاوہ گردن سے اتارنا قرار دے! ایسا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

طاعوت کا صحیح مفہوم

جس طرح التزام جماعت کا صحیح مفہوم جاننا ضروری ہے اسی طرح طاعوت کا صحیح مفہوم معلوم کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ التزام جماعت التزام طاعوت کی شکل اختیار نہ کر سکے۔

طاغوت برون فعلوت کے معنی ہیں کثیر الطغیان، یعنی سرکشی اور نافرمانی میں حد سے بڑھ جانے والا۔ ائمہ لغت نے لکھا کہ:

”طاغوت وہ ہوتا ہے جس کی اطاعت کی جاتی ہو اللہ کے علاوہ اور جو ضلالت کا رئیس ہو۔“ (۱)

قرآن و سنت کی بالادستی سے منحرف حکمران سے بڑا رئیس ضلالت اور کون ہو سکتا ہے؟ مشہور تابعی اور ابن عباسؓ کے شاگرد حضرت مجاہد بن جبر فرماتے ہیں:

”طاغوت انسان کی شکل میں شیطان ہوتا ہے جس کے پاس لوگ اپنے تنازعات فیصلہ کرانے کے لیے لے جاتے ہیں اور وہ ان کا حکم اور صاحب امر ہوتا ہے۔“ (۲)

ابن جریر طبریؒ (متوفی ۳۱۰ھ) نے لکھا ہے کہ:

”میرے نزدیک طاغوت کے بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ اللہ کے مقابلے میں ہر سرکشی کرنے والا طاغوت ہوتا ہے جس کی اللہ کے علاوہ اطاعت کی جاتی ہو، خواہ اس نے جبراً لوگوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کیا ہو یا لوگ اپنی خوشی سے اس کی اطاعت کرتے ہوں، خواہ وہ انسان ہو یا شیطان (جن) ہو۔“ (۳)

طاغوت کے صحیح مفہوم کے بعد یہ سوال غیر متعلق بن جاتا ہے کہ حکومت کو عامۃ الناس کا اعتماد حاصل ہے یا نہیں؟ اور مسلمان رعایا اس کی حکومت پر مجتمع ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ جو حکومت بھی اللہ و رسول کے احکام سے انحراف اور بغاوت اختیار کر لے وہ طاغوت کی تعریف میں شامل ہو جاتی ہے، خواہ وہ استبدادی بادشاہت اور آمریت ہو یا فوجی ڈکٹیٹر شپ ہو اور خواہ وہ جمہوری طریقے سے منتخب حکومت ہو یا اخبار و رہبان کی پابائیت اور تھیو کریسی ہو۔ اس تحقیق کی روشنی میں دیکھا جائے تو پاکستان کی موجودہ حکومت طاغوت ہے، الجماعۃ نہیں ہے، اور اس کی خیر خواہی اور وفاداری کا التزام طاغوت کا التزام ہے، التزام الجماعۃ نہیں ہے، اس لیے کہ یہ حکومت نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت کا التزام نہیں کرتی بلکہ حدود اللہ اور شعائر اللہ کا مذاق اڑاتی ہے۔ اگرچہ پاکستان کا آئین اپنی بنیادی دفعات کے اعتبار سے اسلامی آئین ہے لیکن حکومت غیر اسلامی ہے جو قرآن و سنت اور ملکی آئین دونوں سے منحرف ہو چکی ہے۔ اگرچہ یہ حکومت بالفعل ہے مگر حکومت بالحق نہیں ہے۔ جو لوگ اس کو بھی الجماعۃ قرار

(۱) الصحاح للجوهری ولسان العرب للافریقی (۲) تفسیر ابن کثیر، سورۃ النساء۔

(۳) تفسیر ابن جریر، البقرۃ: ۲۵۶۔

دے کر اس کی وفاداری اور خیر خواہی کو تقاضائے شریعت قرار دیتے ہیں وہ ایک طاغوت کو مذہب کا سہارا دے رہے ہیں۔

قرآن و سنت پر فیصلہ نہ کرنے والوں کو اللہ نے خود کا فر، ظالم اور فاسق کہا ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (۴۳) هُمْ الظَّالِمُونَ (۴۵) هُمُ الْفَاسِقُونَ (۴۷)﴾

”اور جو بھی اللہ کے نازل کردہ قانون پر فیصلہ نہیں کرتے وہی کافر ہیں وہی ظالم ہیں وہی فاسق ہیں۔“

ان آیات میں ”وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ“ کا لفظ نہیں آیا بلکہ ”وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ“ کا لفظ آیا ہے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ”جو لوگ ایمان نہیں لاتے“ بلکہ یوں فرمایا ہے کہ ”جو لوگ فیصلہ نہیں کرتے“۔ تو معلوم ہوا کہ عقیدہ جو بھی ہو مگر جب عملاً قرآن و سنت پر فیصلہ نہیں کرتے اور حکومت کے نظام میں قرآن و سنت کا التزام نہیں کرتے تو وہ کا فر، ظالم اور فاسق ہیں اور ظالم لوگ حکومت اور امامت کے مستحق نہیں ہوتے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے سوال کے جواب میں اللہ نے فرمایا تھا: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ یعنی ظالم لوگ امامت کے حق دار نہیں ہیں۔ البتہ یہ فرق مراتب ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جو لوگ ایمان ہی نہیں لائے ہیں وہ اعتقاداً کافر ہیں اور جو لوگ قرآن و سنت پر اعتقاد اور ایمان تو رکھتے ہیں مگر عملاً قرآن و سنت پر فیصلہ نہیں کرتے تو وہ عملی کفر، عملی ظلم اور عملی فسق کے مرتکب ہیں۔ اعتقادی اور عملی کفر کا فرق اُخروی سزا کے اعتبار سے تو ہے کہ ایک ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا اور دوسرا ہمیشہ نہیں رہے گا، لیکن اس دنیا میں امامت و قیادت کا اہل کافر اور ظالم نہیں ہے، خواہ اعتقادی کفر و ظلم میں مبتلا ہو یا عملی کفر و ظلم کا مرتکب ہو۔ اور جو لوگ سیکولر سیاست کے قائل ہوں اور سیاست و حکومت میں قرآن و سنت کی بالادستی کو ذہناً بھی تسلیم نہ کرتے ہوں، بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہو کہ سیاست میں دین و مذہب کا کوئی دخل نہیں ہے، وہ تو اعتقادی اور فکری کفر کے مرتکب ہیں۔ ان کی اہلیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امام جصاصؒ، امام رازیؒ اور امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ ظالم اور فاسق حکومت کا مستحق نہیں۔ قرآن کا حکم تو یہ ہے: ﴿وَلَا تَطْعَمُ مِنْهُمْ اِثْمًا اَوْ كُفُورًا﴾ (الدھر)

”اور ان میں سے کسی گناہ کرنے والے اور ناشکری کرنے والے کی اطاعت نہ کرو۔“

﴿وَلَا تَطْعَمُ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ اَمْرُهُ

﴿قُرْطًا﴾ (۲۸) (الکھف)

”اور اُس کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتا ہے اور اس کے کام حد سے گزرے ہوئے ہیں۔“

﴿وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ﴾ (۱۵۱) الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشُّعْرَاء)

”اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو حد سے آگے نکل گئے ہیں اور جو زمین میں فساد کرتے ہیں، اصلاح نہیں کرتے۔“

جب اللہ تعالیٰ نے قرآن و سنت پر فیصلہ نہ کرنے والوں کو کفر، ظلم اور فسق کے مرتکب قرار دیا ہے اور اِثم و کُفُور اور مُسْرِف و مُفْسِد کی اطاعت سے منع کر دیا ہے تو آخر ایسے لوگوں کی حکومت الجماعۃ کیسے ہو سکتی ہے؟ جس کا التزام و وفاداری ایمان کا تقاضا ہے اور شریعت کا حکم ہے۔ احادیث تو اس موضوع پر کافی ہیں لیکن حضرت عبادہ بن صامتؓ کی درج ذیل حدیث پر اکتفا کرتا ہوں:

قَالَ دَعَانَا النَّبِيُّ ﷺ فَبَايَعَنَا فَقَالَ فِيمَا أَخَذَ عَلَيْنَا أَنْ بَايَعَنَا عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي مَنْشِطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا وَأَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأُمْرَاءَ إِلَّا أَنْ تَرَوْا بُوَاخًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللَّهِ فِيهِ بُرْهَانٌ (۱)

”حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ ہم کو نبی ﷺ نے بلایا تو ہم نے آپؐ سے بیعت کر لی۔ آپؐ نے ہم پر جو شرطیں لگائی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہم اپنے امیر کی بات سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے خوشی کی حالت میں بھی اور ناخوشی کی حالت میں بھی تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی اور اس حالت میں بھی کہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے اور یہ کہ ہم حکومت و امارت کے بارے میں اس کے اہل کے ساتھ جھگڑا نہیں کریں گے سوائے اس صورت کے کہ تم اس میں ایسا کھلا کفر دیکھو جو جس کے کفر ہونے پر تمہارے پاس اللہ کی جانب سے قطعی دلیل موجود ہو۔“

جو حکومت قرآن و سنت سے منحرف ہو چکی ہو اور ریاست کا نظام سیکولرزم اور لادین

سیاست کے اصولوں پر چلا رہی ہو اس کے اس طرزِ عمل کے کفرِ بواح ہونے کی برہان وہ آیات ہیں جن کا ذکر چند سطور قبل ہو چکا ہے کہ ایسی حکومت طاغوت ہے، کافر ہے، ظالم ہے اور فاسق ہے۔ جو سکا لریہ کہتے ہیں کہ عامۃ الناس کی معتد حکومت اگر کفرِ بواح کی مرتکب ہو پھر بھی وہ ”الجماعۃ“ ہے وہ اس حدیث پر غور فرمائیں کہ اس میں یہ بات کہاں ہے کہ جس حکومت کو عوام کا اعتماد حاصل ہو وہ اگر کفرِ بواح کا ارتکاب کرے پھر بھی اس کا التزام کیا جائے؟ باقی رہی شوریٰ کے بارے میں آیات و احادیث تو ان کا مفہوم تو یہ ہے کہ اسلامی حکومت مسلمانوں کے مشورے اور ان کی رائے سے بنے گی اور مشورے سے چلے گی۔ سیکولر جمہوریت کا اصول تو یہ ہے کہ جب تک عوام کا اعتماد کسی حکومت کو حاصل ہو اُس وقت تک اس کو حکومت کرنے کا حق حاصل رہتا ہے، لیکن اسلام کے شورائی نظام کا اصول تو یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی معتد حکومت اگر اللہ و رسول کے احکام سے باغی ہو جائے پھر بھی وہ اسلامی حکومت ہوگی اور اس کے ساتھ چمپے رہنا دین و ایمان کا تقاضا ہوگا!

(۶) الجماعۃ بمعنی اہل سنت والجماعۃ

احادیث میں ”الجماعۃ“ کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر بھی ہوا ہے جو فکر و عمل کے اعتبار سے سنتِ رسولؐ اور سنتِ اصحابِ رسولؐ کا التزام کرتے ہیں، جن کو اصطلاحاً اہل سنت والجماعۃ کہا جاتا ہے۔ ”الجماعۃ“ کا یہ مفہوم اس حدیث سے ماخوذ ہے جو حدیثِ افتراقِ امت کے نام سے مشہور ہے۔

حدیثِ افتراقِ امت اور اس کا مفہوم

عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ: أَلَا إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَامَ فِينَا فَقَالَ: ((أَلَا إِنَّ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ افْتَرَقُوا عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً وَإِنَّ هَذِهِ الْمِلَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ، ثِنْتَانِ وَسَبْعُونَ فِي النَّارِ وَوَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَهِيَ الْجَمَاعَةُ)) وَفِي رِوَايَةٍ: ((وَأَنَّهُ سَيَخْرُجُ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ تَحَارَى بِهِمْ تِلْكَ الْأَهْوَاءُ كَمَا يَتَجَارَى الْكَلْبُ لِصَاحِبِهِ — وَقَالَ عَمْرُو الْكَلْبُ بِصَاحِبِهِ — لَا يَبْقَى مِنْهُ عُرْقٌ وَلَا مَفْصَلٌ إِلَّا دَخَلَهُ))

”حضرت معاویہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر

فرمایا: ”لوگو سنو! جو اہل کتاب تم سے پہلے گزر چکے ہیں وہ ۷۲ فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور یہ ملت (میری اُمت) ۳۷ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں سے ۷۲ دوزخ میں جائیں گے اور ایک جنت میں جائے گا، یہی جنت میں جانے والے ”الجماعۃ“ ہیں۔“ دوسری روایت میں اس کے بعد آپ کے یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں کہ: ”میری اُمت میں ایسے گروہ بھی ظاہر ہوں گے جن کے اندر یہ خواہشات نفس اس طرح پھیل جائیں گی جس طرح کہ پاگل کتے کے کاٹے ہوئے شخص کے جسم میں اس کے جراثیم پھیل جاتے ہیں کہ اس کی کوئی رگ اور بند ایسا نہیں ہوتا جس میں جراثیم داخل نہ ہوئے ہوں۔“ (۱)

ترمذی کی روایت میں آیا ہے کہ صحابہؓ نے پوچھا:

مَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: ((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي)) (۲)

”یا رسول اللہ! یہ کون سی جماعت ہوگی؟ تو آپ نے فرمایا: ”یہ وہ جماعت ہوگی جو میری سنت اور میرے اصحاب کی سنت پر قائم ہو۔“

ایک دوسری حدیث میں اس ”الجماعۃ“ کو ”السواد الاعظم“ کا نام دیا گیا ہے۔ تفریق اُمت کی یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، مسند احمد، صحیح ابن حبان اور مستدرک میں نقل ہوئی ہے۔ اس کے بعض طرق صحیح ہیں، بعض حسن ہیں اور بعض ضعیف بھی ہیں۔ حافظ شمس الدین سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ۱۵ اصحاب سے اسانید کثیرہ کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ (۳)

اسی مضمون کی ایک حدیث نسائی، مسند احمد، دارمی اور دوسری کتابوں میں نقل ہوئی ہے جس میں اللہ کے راستے کے آس پاس شیطانی راستوں کا ذکر ہوا ہے، مگر ان راستوں کی تعداد نہیں بتائی گئی۔

عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خَطًّا ثُمَّ قَالَ: ((هَذَا سَبِيلُ اللَّهِ)) ثُمَّ خَطَّ خُطُوطًا عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ وَقَالَ: ((هَذَا سُبُلٌ عَلَى كُلِّ سَبِيلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُو إِلَيْهِ)) وَقَرَأَ: ﴿وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمًا﴾

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب شرح السنۃ

(۲) سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول اللہ، باب ما جاء فی افتراق هذه الامۃ۔

(۳) المقاصد الحسنۃ، ص ۱۵۸، بیروت، ۱۹۸۶ء۔

فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ ﴿الانعام: ۱۵۳﴾ (۱)
”ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سمجھانے کے لیے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا کہ: ”یہ اللہ کا راستہ ہے۔“ پھر اس کے دائیں بائیں لکیریں کھینچیں اور فرمایا کہ: ”یہ وہ راستے ہیں جن میں سے ہر راستے پر ایک شیطان بیٹھا ہوا ہے جو لوگوں کو اپنے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے۔“ اس تمثیل کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی کہ: ”یہ میرا راستہ ہے“ اسی پر چلتے رہو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو، یہ تم کو اللہ کے راستے سے ہٹا دیں گے۔“

رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس تمثیل میں سبیل اللہ کو خط مستقیم سے تشبیہ دی ہے اور قرآن کریم میں ان کے اس راستے کو صراط مستقیم، قصد السبیل اور الَّتِي هِيَ أَقْوَمُ کہا گیا ہے۔ یعنی سیدھا و کشادہ اور افراط و تفریط کے درمیان اعتدال و توازن پر مبنی راستہ یہی قرآن و سنت کا راستہ ہے۔ اور شیطانی راستوں کو ان ترچھی اور ٹیڑھی لکیروں سے تشبیہ دی ہے جو خط مستقیم کے دائیں بائیں کھینچی گئی ہیں۔ یہ ان بدعتی فرقوں کے راستے ہیں جنہوں نے اپنا رابطہ اسلام سے بالکل منقطع نہیں کیا بلکہ اسلام کی شاہراہ سے اپنے لیے رابطہ سڑکیں بنالی ہیں۔

افتراق اُمت کی حدیث میں جن ۷۲ فرقوں کا ذکر ہوا ہے وہ بھی اُمت مسلمہ اور اہل قبلہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر انہوں نے خواہش نفس اور قرآن و سنت کی نصوص میں تکلفی تاویلات کی بنا پر سنت رسول اور سنت اصحاب رسول کے خلاف بدعات و ضلالت کے راستے نکال لیے ہیں اور ان پر چل پڑے ہیں۔ ان میں سے خوارج اور روافض اور بعض دوسرے فرقے سیاسی مقاصد رکھتے تھے اور کچھ دوسرے عوامل کی وجہ سے بنے تھے۔ مقاصد اور عوامل جو بھی تھے ان کی تفصیل اس وقت پیش نظر نہیں ہے، مگر تھے یہ بدعتی فرقے جنہوں اسلام سے اپنا تعلق توڑے بغیر سواد اعظم سے اپنے راستے الگ کر دیے تھے۔ حدیث میں یہ نہیں آیا کہ اُمت میں ہمیشہ کے لیے ۷۲ فرقے رہیں گے اور ان میں کی بیشی کبھی نہیں ہوگی۔ بعض شارحین حدیث نے تو کہا ہے کہ ۷۲ سے یہ مخصوص عدد مراد نہیں ہے، بلکہ یہ کنایہ ہے کثرت سے اور مراد یہ ہے کہ میری اُمت میں بہت سے فرقے اور چھوٹے بڑے گروہ پیدا ہو جائیں گے جو میری اور میرے اصحاب کی سنت کا التزام نہیں کریں گے، بلکہ ہوائے نفس پر مبنی فلسفیانہ

(۱) مشکوٰۃ، باب الاعتصام، فصل ثالث۔

خیالات رکھیں گے۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ:

((فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمُهَدِّدِينَ))

”لیکن تم میں سے جو زندہ رہا تو بہت سے اختلافات دیکھ لے گا۔ پس اُس وقت تم میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدینؓ کی سنت کا التزام کرو۔“

لیکن اکثر شارحین نے ۷۲ کا عدد مراد لیا ہے، مگر یہ کسی نے بھی نہیں کہا کہ اُمت میں ہمیشہ کے لیے یہی فرقے رہیں گے، نہ کم ہوں گے اور نہ زیادہ ہوں گے۔ اس لیے کہ حدیث میں یہ بات موجود ہی نہیں ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہی تعداد رہے گی۔ یہ ۷۲ بدعتی فرقے کون ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے نہ ان کے نام بتائے ہیں نہ ان کے عقائد و نظریات کی تفصیلات بتانا ضروری سمجھا ہے، بلکہ صرف ایک جامع قسم کی صفت اور علامت بتادی ہے جس سے وہ پہچان لیے جائیں گے اور وہ صف و علامت یہ ہے کہ وہ سنت رسولؐ، سنت خلفاء راشدین اور سنت اصحاب رسولؐ کا التزام نہیں کریں گے بلکہ ہوائے نفس کا اتباع کریں گے۔ چنانچہ جب یہ فرقے نمودار ہوئے تو مسلمانوں نے پہچان لیے اور محدثین نے ان کے نام اور عقائد معلوم کر کے بتا دیے تاکہ اُمت ان سے اجتناب کرے۔

اہل بدعت کے ۷۲ فرقے

چوتھی صدی ہجری کے ایک عالم ہیں جو ابن بطہ عکبری کے نام سے مشہور ہیں۔ ”بطہ“ ان کے اجداد میں سے کسی کا لقب تھا اور عکبر بغداد سے ۵۷۵ فرسخ کے فاصلے پر دریائے دجلہ کے ساحل پر ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ انہوں نے یوسف بن اسباط اور عبداللہ بن مبارک کا قول نقل کیا ہے کہ:

”تمام بدعتی فرقوں کے اصل فرقے چار ہیں: روافض (شیعہ) خوارج، قدریہ

(معتزلہ) اور مرجہ۔ باقی جتنے چھوٹے بڑے فرقے اور گروہ بنے ہیں وہ انہی چار کی ذیلی شاخیں اور گروپ ہیں جو الگ الگ ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔“^(۱)

لیکن علم الکلام کی معروف کتاب المواقف میں لکھا ہے کہ:

”بڑے اسلامی فرقے آٹھ ہیں: معتزلہ، شیعہ، خوارج، مرجہ، نجاریہ، جبریہ، مشبہ اور

ناجیہ (یعنی نجات پانے والی جماعت اہل سنت والجماعۃ)۔“

اس کے بعد ان آٹھ فرقوں کی ذیلی شاخوں اور گروپوں کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

معتزلہ: ۲۰ شیعہ: ۲۲ خوارج: ۲۰ مرجہ: ۵

نجاریہ: ۳ جبریہ: ۱ مشبہ: ۱ ناجیہ: ۱ گل: ۳۷

ان ۷۲ فرقوں سے منسلک لوگ مجموعی طور پر بھی ہر دور میں ”الجماعۃ“ اور ”السواد الاعظم“ سے منسلک مسلمانوں کے مقابلے میں ۵ فیصد سے بھی کم رہے ہیں۔ اور آج تو سوائے شیعہ کے مذکورہ ناموں سے موسوم غالباً ایک فرقہ بھی دنیا میں موجود نہیں ہے۔ مشہور اسلامی فرقے تو آج صرف دو ہیں: ایک اہل سنت والجماعۃ اور دوسرا شیعہ۔ مگر یہ بات کبھی بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ اہل سنت میں تمام وہ مکاتب فقہ شامل ہیں جو سنت رسولؐ اور سنت اصحاب رسولؐ کا عقیدہ اور عمل دونوں میں التزام ضروری سمجھتے ہیں۔ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ، اہل حدیث اور اہل ظاہر سب اہل سنت والجماعۃ میں شامل ہیں۔ اسی طرح پاکستان اور عالم اسلام کی وہ تمام اسلامی تحریکیں اور دینی تنظیمیں جو مذکورہ اصول کا التزام کرتی ہیں، جس نام سے بھی موسوم ہوں سب کی سب اہل سنت والجماعۃ میں شامل ہیں اور سب ایک بہت بڑی عالمی نظریاتی جماعت یعنی الجماعۃ کے اعضاء ہیں اور اس کی ذیلی برادر تنظیمیں ہیں۔ فروع و جزئیات میں تعبیر و اجتہاد کے تنوع کی وجہ سے جو اختلاف آراء اہل سنت کے مکاتب فقہ کے درمیان موجود ہے یا طریقہ کار، حکمت عملی اور مذاہب کا جو تنوع اہل سنت کی ذیلی برادر تنظیموں اور تحریکوں میں نظر آ رہا ہے یہ اہل سنت کے ملت واحدہ اور الجماعۃ ہونے کے منافی نہیں ہے۔

اہل بدعت ۷۲ فرقوں کے افکار اور خیالات کی تفصیل شرح مواقف، الاعتصام للشاطبی اور الملل والنحل کی کتابوں میں شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئی ہے، لیکن یہ تفصیل اس وقت موضوع سے کچھ زیادہ تعلق بھی نہیں رکھتی اور اس کی اب وہ افادیت بھی نہیں رہی جو ان فرقوں کے ظہور کے وقت تھی۔ آج کل نفاذ شریعت کے مخالفین اور سیکولرازم کے مؤیدین کہتے پھرتے ہیں کہ کس فرقے کی شریعت نافذ کریں؟ اسلام میں تو ۳۷ فرقے ہیں! یہ بات کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو اسلامی نظام اور نفاذ شریعت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو ۳۷ فرقوں کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکے ہیں۔ اس لیے کہ اسلام کا تحقیقی علم تو دینی مدارس میں حاصل کیا جاسکتا ہے اور انہوں نے فرنگی طرز کی ملکی یا غیر ملکی

(۱) الابانۃ عن شریعة الفرق الناجیة، طبع بیروت ۱۹۸۸ء، ص ۳۷۷، ج ۱۔

یونیورسٹیوں میں علم حاصل کیا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کو جواب دینے کے لیے اور دوسری قسم کے مسلمانوں کو سمجھانے کے لیے عرض ہے کہ یہ برائے نام ۲ فرقے، بلکہ اگر ان کے مزید ذیلی گروپوں کو شمار کیا جائے تو اس سے بھی زیادہ فرقے، مجموعی طور پر اہل سنت کے مقابلے میں ۵ فیصد سے بھی کم رہے ہیں اور آج ان کا دنیا میں نام بھی باقی نہیں رہا۔ اصل ملت واحدہ وہی ہے جس کو ”ناجیہ“ کہا گیا ہے اور وہ ہے ”الجماعۃ“، بمعنی اہل سنت والجماعۃ۔ اس وقت تو عملاً دو ہی اسلامی فرقے ہیں: شیعہ اور سنی۔ اور دونوں کے ممتاز اور نمائندہ ۳۱ علماء نے جنوری ۱۹۵۱ء میں اسلامی ریاست کے لیے ۲۲ دستوری نکات پر مکمل اتفاق کر لیا تھا۔ اور ۲۳ اپریل ۱۹۹۵ء کو ملی یک جہتی کونسل کے اجلاس منعقدہ لاہور میں دونوں کے ۷۰ ممتاز اور نمائندہ علماء نے ان ۲۲ نکات پر دوبارہ دستخط کر دیے ہیں اور کونسل کے منظور کردہ سترہ نکاتی ضابطہ اخلاق میں پہلا نکتہ ان ۲۲ نکات کی توثیق ہے۔ ”خوئے بد بہانہ بسیار“ کے طور پر سیکولرزم کے پجاریوں کا یہ ۳ فرقوں والا بہانہ بھی اب ختم ہو گیا ہے۔ عملاً تو سوائے شیعہ کے اہل بدعت کے فرقے موجود ہی نہیں ہیں، لیکن افتراقِ اُمت کی صحیح حدیث کو سمجھنے کے لیے ایک سوال کا جواب دینا ضروری ہے۔

سوال: رسول اللہ ﷺ نے الجماعۃ کے علاوہ باقی ۲ فرقوں کو دوزخی کہا ہے۔ دوسری طرف ان کو اپنی اُمت اور ملت بھی کہا ہے کہ میری اُمت ۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ تو دوزخی فرقے رسول اللہ ﷺ کی اُمت کیسے ہو سکتے ہیں؟

جواب: دوزخ کی آگ کی نسبت صرف کفر بواح کی طرف نہیں کی جاتی بلکہ قرآن و سنت کی متعدد نصوص میں دوزخ، لعنت اور قہر و غضب کی نسبت ان مسلمانوں کی طرف بھی کی گئی ہے جو سنت رسول اور سنت اصحاب رسول کا التزام نہیں کرتے، اگرچہ اسلام کے قطعی عقائد کو مانتے ہیں، کبار کا ارتکاب کرتے ہیں۔ البتہ ان بدعتی لوگوں میں سے ایسے بھی تھے جو کفر بواح کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ تو ملت اسلامیہ سے خارج اور خلود فی النار یعنی دوزخ میں ہمیشہ رہنے کے مستحق ہیں، لیکن ان فرق ضالہ میں سے جو کفر بواح کا عقیدہ تو نہیں رکھتے تھے مگر اپنی تاویل فاسد کی بنا پر اعتقاد فاسد رکھتے تھے وہ مسلمان ہونے کے باوجود دخول فی النار یعنی دوزخ میں کچھ وقت کے لیے داخل ہونے کے مستحق تھے اس لیے حدیث میں ان کو فی النار کہا گیا ہے۔ باقی رہے اہل سنت کے وہ لوگ جو کبار کے ارتکاب اور فرائض کے ترک میں مبتلا ہوں وہ اپنے برے اعمال کی وجہ سے دخول فی النار کے مستحق

ہوتے ہیں، اعتقاد فاسد کی وجہ سے اس کے مستحق اس لیے نہیں ہوتے کہ عقیدتا تو وہ الجماعۃ میں شامل ہوتے ہیں جو جماعت ناجیہ ہے۔ کُلُّهُمْ فِي النَّارِ کی یہی تحقیق شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کی ہے اور اس کو محققین کا قول کہا ہے۔^(۱)

اہل سنت والجماعۃ کا صحیح مفہوم

جماعت ناجیہ کو بعض احادیث میں ”الجماعۃ“ کہا گیا ہے، بعض میں ”السواد الاعظم“ کہا گیا ہے اور بعض میں ”مَا آتَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي“ کہا گیا ہے۔ ان تینوں کا مفہوم ایک ہے۔ اس لیے کہ ”الجماعۃ“ میں الف لام عہد کے لیے ہے اور مراد ہے وہ جماعت جو سنت رسول اور سنت اصحاب رسول پر قائم ہو۔ یہ جماعت بدعتی فرقوں کے مقابلے میں ہر دور میں اکثریت ہی میں نہیں بلکہ غالب ترین اکثریت میں رہی ہے، اس لیے اس کو ”السواد الاعظم“ کا نام بھی دیا گیا ہے، یعنی بڑی جماعت۔ لیکن الاعظم کے معنی اعظم شاناً و رفعتاً بھی آتے ہیں، یعنی بڑی شان اور رفعت و درجے والی جماعت، اگرچہ اس کی تعداد سب سے کم ہو۔ احادیث میں آیا ہے کہ قیامت کے قریب ایک دور ایسا بھی آئے گا کہ حق پر قائم رہنے والے مسلمان بہت کم ہوں گے اور معاشرے میں وہ غریب اور اجنبی ہوں گے۔ الجماعۃ کا یہ مفہوم (یعنی اہل سنت والجماعۃ) اس حدیث سے بھی ماخوذ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((وَلَنْ تَزَالَ هَذِهِ الْأُمَّةُ — وَفِي رِوَايَةٍ: لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي — وَفِي رِوَايَةٍ: لَا تَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ قَائِمَةٌ عَلَى أَمْرِ اللَّهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ — وَفِي رِوَايَةٍ: مَنْ خَذَلَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ))^(۲)

”میری اُمت میں سے ایک جماعت اللہ کے دین پر قائم رہے گی اور مخالفت کرنے والے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے (دین سے نہیں ہٹائیں گے) یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے گا۔“

اس مضمون کی متعدد احادیث حضرات معاویہ، مغیرہ بن شعبہ، ثوبان، جابر بن سمرہ، جابر بن عبد اللہ عقبہ بن عامر اور عبد اللہ بن عامر سے بخاری و مسلم میں نقل ہوئی ہیں کہ یہ

(۱) لمعات التنقیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، ص ۲۳۵، ج ۱۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب العلم و کتاب الاعتصام و کتاب المناقب۔

کون سی جماعت ہے جس کا تسلسل برقرار رہے گا اور وقت مقررہ تک دنیا سے ان کا وجود مٹایا نہیں جاسکے گا؟

امام بخاری نے تو کتاب الاعتصام کے ایک ترجمۃ الباب میں اپنی رائے یہ دی ہے: ہم اہل العلم ”یہ اہل علم ہیں“۔ ابن حجر اور امام نووی نے امام احمد بن حنبل کا قول نقل کیا ہے کہ:

”اگر یہ اہل حدیث نہیں ہیں تو میں نہیں جانتا کہ اور کون ہو سکتے ہیں؟ قاضی عیاض نے فرمایا کہ امام احمد کی مراد اہل سنت والجماعت ہیں“۔

امام بخاری اور امام احمد کے اقوال میں صرف تعبیر کا فرق ہے۔ اس لیے کہ اہل حدیث یعنی اہل سنت کی دینی اور فکری قیادت ظاہر ہے کہ اہل علم ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی علمی قیادت کے بغیر تو وہ دین پر قائم نہیں رہ سکتے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ:

”ضروری نہیں ہے کہ اس جماعت کے افراد ایک ہی مقام پر کام کرتے ہوں بلکہ یہ زمین کے اقطار و اطراف میں پھیلے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں۔ کچھ ان میں سے بہادر اور دلیر مجاہد ہوں گے، کچھ فقہاء اور محدثین ہوں گے، کچھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرتے ہوں گے اور کچھ خیر اور بھلائی کے دوسرے کام کرتے ہوں گے۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ یہ صورت حال دور نبوی سے لے کر آج تک قائم رہی ہے اور اُس وقت تک قائم رہے گی جب تک اللہ کا وہ حکم نہ آ جائے جس کا ذکر حدیث میں ہوا ہے۔“ (۱)

اللہ کے جس حکم کا حوالہ اس حدیث میں دیا گیا ہے اس کا ذکر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ:

”پھر اللہ تعالیٰ ایسی ہوا بھیج دے گا جو مشک کی طرح خوشبودار اور ریشم کی طرح نرم ہو گی، اور جب ایسے شخص پر گزرے گی جس کے دل میں ایک دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا تو اس کی روح قبض کرے گی۔ اس کے بعد زمین پر بدترین لوگ ہی رہ جائیں گے اور ان پر قیامت قائم ہو جائے گی۔“ (۲)

اس سلسلے میں ایک دوسری مشہور حدیث بھی قابل غور ہے جو ایک طویل حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے پہلے ان پانچ احکام کا ذکر فرمایا ہے جن پر عمل کرنے اور بنی اسرائیل کو

ان پر عمل کرنے کی ترغیب دلانے کا حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ کو دیا تھا اور انہوں نے بیت المقدس میں ایک اجتماع بلا کر وہ احکام بیان فرمائے تھے۔ وہ پانچ احکام تھے: عقیدہ توحید، نماز، روزہ، صدقہ اور اللہ کا ذکر۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَأَنَا أَمْرُكُمْ بِخَمْسٍ اللَّهُ أَمَرَنِي بِهِنَّ: السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ وَالْجِهَادُ وَالْهَجْرَةُ وَالْجَمَاعَةُ، فَإِنَّهُ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ قِيدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ إِلَّا أَنْ يَرْجِعَ، وَمَنْ ادَّعَى الدَّعْوَى الْجَاهِلِيَّةَ فَإِنَّهُ مِنْ جُنَا جَهَنَّمَ)) فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللَّهِ وَإِنْ صَلَّى وَصَامَ؟ قَالَ: ((وَإِنْ صَلَّى وَصَامَ فَادْعُوا بِدَعْوَى اللَّهِ الَّتِي سَمَّاكُمْ الْمُسْلِمِينَ الْمُؤْمِنِينَ عِبَادَ اللَّهِ)) (۱)

”اور میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے: سنا، ماننا، جہاد کرنا، ہجرت کرنا، اور الجماعت کا التزام کرنا، اس لیے کہ جو شخص الجماعت سے باشت برابر بھی الگ ہوا تو اس نے اسلام کا قلابہ اپنی گردن سے اتار دیا الایہ کہ دوبارہ لوٹ آئے۔ اور جو لوگ جاہلیت (نسلی عصیت) کی دعوت دیتے ہیں تو وہ جہنمی جماعتیں ہیں“۔ ایک شخص نے پوچھا کہ اگرچہ وہ نماز پڑھتے ہوں اور روزہ رکھتے ہوں؟ فرمایا: ”اگرچہ نماز پڑھتے ہوں اور روزہ رکھتے ہوں۔ پس اللہ کے بندو! تم لوگوں کو اللہ کی جانب بلاؤ جس نے تم کو مسلمین اور مؤمنین کا نام دیا ہے۔“

ترمذی کے مشہور شارح قاضی ابن العربی فرماتے ہیں کہ سب سے مراد کانوں سے سنا نہیں ہے بلکہ دل سے قبول کرنا مراد ہے، ورنہ کانوں سے سنا اور دل میں قبول نہ کرنا تو منافقین کی عادت ہے: ((الَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ)) (الانفال: ۲۱) ”جو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ہے، حالانکہ وہ دل میں قبول نہیں کرتے“۔ ”طاعت“ سے مراد ہے عمل کرنا جو دل سے قبول کرنے کی نشانی ہے۔ جہاد اور ہجرت کے معنی معروف و معلوم ہیں، اور التزام

(۱) سنن الترمذی، ابواب الامثال۔ ومسند احمد، طبع دار صادر، ص ۳۰، ۲۰، ج ۴۔

والصحيح لابن خزيمة، ص ۹۵، ج ۳۔ وموارد الظمان بروائد ابن حبان، ص ۲۹۹۔

والسنن الكبرى للبيهقي، ص ۵۷، ج ۸۔ وشرح السنة للبخاري، ص ۵۱، ج ۱۰۔

ومشکوٰۃ المصابيح، كتاب الامارة، فصل ثانی۔

(۱) شرح مسلم، كتاب الامارة۔

(۲) صحيح مسلم، كتاب الامارة۔

جماعت کے معنی ہیں:

”اس طریقے کا التزام کرنا جس پر دوسرے لوگ عمل کرتے ہیں اور یہ کہ انسان ان کے راستے سے الگ نہ رہے۔ یہ الجماعۃ (جس کے التزام کا حکم دیا گیا ہے) صحابہ و تابعین اور بہترین مسلمانوں کی جماعت ہے جو دین اور حق کی شاہراہ پر قائم رہتے ہیں۔“ (۱)

علامہ طیبی (متوفی ۷۴۳ھ) لکھتے ہیں:

”الجماعۃ سے مراد صحابہؓ ہیں یعنی میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ جماعت صحابہؓ کے طریقے پر قائم رہو اور اپنے آپ کو ان کی جماعت سے منسلک رکھو..... بالشت برابر الگ رہنے سے مراد یہ ہے کہ جو بھی سنت کے ترک کرنے اور بدعت کے ارتکاب کی وجہ سے الجماعۃ سے جدا ہوا، اگرچہ بہت تھوڑا سا الگ ہوا ہو تو اس نے اسلام کا عہد توڑ لیا اور اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا۔“ (۲)

ملا علی قاری (متوفی ۱۰۲۴ھ) نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں اور مولانا عبدالرحمن مبارکپوری (متوفی ۱۳۵۳ھ) نے تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں بھی اسی طرح کی تشریح کی ہے۔ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلامی حکومت پر مجتمع و متحد ہونے والے مسلمانوں کو بھی الجماعۃ کہا جاتا ہے اور التزام جماعت کی ہیئت کاملہ اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے۔ لیکن احادیث میں الجماعۃ کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر بھی ہوا ہے جو سنت رسولؐ اور سنت صحابہؓ کا التزام کرتے ہوں جن کو اہل سنت والجماعۃ کہا جاتا ہے، اگرچہ ان کے پاس حکومت اور اقتدار موجود نہ ہو۔ اور التزام جماعت کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اہل سنت والجماعۃ کے اصولوں کی پابندی کی جائے اور ان سے خروج و شذوذ نہ کیا جائے۔ لیکن یہاں پر دو سوال پیدا ہو سکتے ہیں جن کا حل کرنا ضروری ہے۔

سوال (۱): جب ان کی اپنی اسلامی حکومت نہیں ہوگی تو پھر کس چیز پر مجتمع ہوں گے؟

جواب: وہ ”مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي“ پر مجتمع ہوں گے، یعنی ان اصول و عقائد پر ان کا اجتماع و اتحاد ہوگا جو سنت رسولؐ اور اجماع صحابہؓ سے ثابت ہیں۔ اصول و افکار پر مجتمع ہونے والے افراد پر بھی ملت، اُمت اور الجماعۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔

سوال (۲): جماعت کے لیے تو امیر کی ضرورت ہوتی ہے، تو امیر کے بغیر صرف مشترکہ اصولوں پر اشتراک و اجتماع کی بنیاد پر اہل سنت پر الجماعۃ کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے؟

جواب: اصولی اور نظریاتی جماعتوں کی اصل قیادت وہ افکار کرتے ہیں جن پر ان جماعتوں کی تشکیل ہوئی ہو۔ اُمت مسلمہ کی اصل قیادت و ہدایت بھی قرآن و سنت کرتے ہیں اور عملاً حق شناس، حق پرست علماء دین ”الجماعۃ“ کے فکری راہنما اور غیر حکومتی امراء و حکام ہوتے ہیں۔ اولوالامر کا لفظ اپنے عموم کے لحاظ سے دونوں طبقوں کو شامل ہے، یعنی علماء و فقہاء کو بھی اور امراء و حکام کو بھی، اس لیے کہ نظام امر انہی دو طبقوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ (۱)

(۷) جماعت المسلمین کا صحیح مفہوم

حضرت خذیفہ بن یمانؓ سے مروی ایک حدیث رسولؐ میں جماعت المسلمین اور اس کے امام کے التزام کا حکم دیا گیا ہے جسے بعض حضرات ایک مخصوص جماعت کے التزام کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ جماعت المسلمین کے التزام کا صحیح مفہوم بھی واضح کر دیا جائے، تاکہ التزام جماعت پر تحریر کردہ اس مضمون میں کوئی تشکیک باقی نہ رہے۔ پہلے حضرت خذیفہؓ کی پوری حدیث ملاحظہ کر لیجیے!

”خذیفہؓ فرماتے ہیں کہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے ”خیر“ کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور میں ”شر“ کے بارے میں زیادہ سوال کیا کرتا تھا، اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں یہ شرح مجھ پہ نہ آ جائے۔ چنانچہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم لوگ جاہلیت اور شر کی حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ یہ خیر ہمارے پاس لے آئے (ایمان و اسلام اور امن و امان) تو کیا اس خیر کے بعد دوسرا خیر آئے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ”ہاں! آئے گا۔“ میں نے کہا اس شر کے بعد دوسرا خیر آئے گا؟ فرمایا: ”ہاں! آئے گی، مگر اس میں گدلا پن ہوگا۔“ میں نے پوچھا یہ گدلا پن کیسا ہوگا؟ فرمایا: ”ایسے لوگ آئیں گے جو میری سنت کے خلاف قوم کی راہنمائی کریں گے۔ تو ان میں اچھے کام بھی دیکھے گا اور بُرے کام بھی دیکھے گا۔“ میں نے کہا کیا اس قسم کی خیر کے بعد پھر شر آئے گا؟ فرمایا: ”ہاں! ایسا شر آئے گا کہ جہنم کے دروازوں پر بلانے والے بیٹھے

(۱) احکام القرآن، ص ۲۱۰، ج ۲۔ و تفسیر ابن کثیر، سورة النساء، آیت ۵۹۔

و مشکل الآثار، ص ۴۷۶، ج ۱

(۱) عارضة الاحوذی، شرح ترمذی، ابواب الامثال

(۲) الکاشف عن حقائق السنن، شرح مشکوٰۃ، ص ۲۰۰، ۲۰۱، ج ۷۔

ہوں گے اور جو لوگ ان کی دعوت قبول کریں گے وہ ان کو جہنم میں پھینک دیں گے (یعنی ضلالت کی راہ پر لگا دیں گے)۔ میں نے عرض کیا کہ ان کی کچھ صفات بیان کیجیے! فرمایا: ”وہ ہماری ہی قوم میں سے ہوں گے اور ہماری زبان بولیں گے۔“

قُلْتُ فَمَا تَأْمُرُنِي أَنْ أَذَرَكُنِي ذَٰلِكَ؟ قَالَ: ((تَلْزِمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِينَ وَإِمَامَهُمْ)) قُلْتُ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ جَمَاعَةٌ وَلَا إِمَامٌ؟ قَالَ: ((فَاعْتَزِلْ بِلُكِ الْفِرَقِ كُلِّهَا وَلَوْ أَنْ تَعْصِ بِأَصْلِ شَجَرَةٍ حَتَّى يَذَرِكَ الْمَوْتُ وَأَنْتَ عَلَى ذَٰلِكَ)) (۱)

”میں نے کہا کہ اگر یہ زمانہ مجھ پر آ گیا تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ”مسلمانوں کی جماعت اور مسلمانوں کے امام کے ساتھ لگے رہو۔“ میں نے عرض کی کہ اگر مسلمانوں کی جماعت بھی نہ ہو اور ان کا کوئی امام بھی موجود نہ ہو تو پھر کیا کروں گا؟ آپ نے فرمایا: ”ان سارے فرقوں سے الگ ہو جاؤ اگرچہ تمہیں کسی درخت کی جڑوں کو دانتوں سے مضبوط پکڑنا پڑے (یعنی درخت کے نیچے لوگوں سے الگ زندگی گزارنی پڑے) یہاں تک کہ جب تم پر موت آئے تو تم اسی حالت پر ہو۔“

اس حدیث میں جن ادوار کی پیشین گوئی کی گئی ہے شارحین حدیث نے ان کے تعین کی کوشش بھی کی ہے، لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے کسی کا نام لے کر یا سال بتا کر تعین نہیں کیا تو ہمارے لیے بھی خاموش رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ مگر حدیث میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ اور دو نہیں آئیں گے۔ اُمت پر کئی اچھے بُرے ادوار گزر چکے ہیں اور کئی اچھے بُرے ادوار اور آئیں گے، یہاں تک کہ نزول عیسیٰ کے بعد اس دُنیا میں خلافت علیٰ منہاج العبود جیسا دور دوبارہ آئے گا۔ اور قیامت سے قبل یہ دُنیا خیر سے بالکل خالی ہو جائے گی اور شرار الناس یعنی بدترین لوگوں پر قیامت آئے گی۔

ہمارے لیے اس حدیث میں جو ہدایت ہے اس میں کوئی ابہام نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ جب بدعت و ضلالت کے غلبے کا دور آجائے اور بدعتیوں کا ہر فرقہ گروہ اور جماعت لوگوں کو اپنی طرف بلائے تو تم ان ائمہ بدعت و ضلالت میں کسی کی دعوت قبول نہ کرو اس لیے کہ وہ

اسلام کے نام پر ضلالت کی دعوت ہوگی، بلکہ مسلمانوں کی اس جماعت کے ساتھ لگے رہو اور چمٹے رہو جو قرآن و سنت کا التزام کرنے والے امیر کی امارت پر مجتمع ہوں، چاہے وہ صلاحیت کے اعتبار سے اپنے وقت کا معیاری مسلمان ہو یا اس کے اندر کچھ خرابیاں بھی موجود ہوں، مگر جب تک اُس حکمران نے طاغوت کی شکل اختیار نہ کی ہو اور قرآن و سنت سے منحرف نہ ہو اور اُس وقت تک اسی کا التزام کرنا دین کا تقاضا ہوگا۔ لیکن اگر تم ایسی صورت حال سے دوچار ہو گئے ہو کہ مسلمانوں کا اجتماعی نظام درہم برہم ہو گیا ہو اور قرآن و سنت کی بالادستی تسلیم کرنے والی کوئی حکومت موجود نہ ہو اور اس نظام کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنے والی ایسی دینی جماعت بھی موجود نہ ہو جو قرآن و سنت کا التزام کرتی ہو اور تم اپنے اندر تنہا حالات کا مقابلہ کرنے یا جماعت بنانے کی قوت بھی نہ پاتے ہو، بلکہ تمہارے اپنے دین و ایمان کو خطرہ درپیش ہو تو ایسے حالات میں اپنے ایمان کے بے بہا خزانے کے تحفظ کے لیے لوگوں سے الگ ہو کر کسی محفوظ جگہ میں بیٹھ کر زندگی کے باقی دن پورے کرنا زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں اپنے دین کو بچانے کے لیے فرار من الفتن کی رخصت ہی نہیں بلکہ فضیلت بیان ہوئی ہے۔ (۱)

باقی رہی یہ بات کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کیا ایسے حالات موجود ہیں یا نہیں؟ تو اس کا فیصلہ وہ شخص خود اپنی فراست و بصیرت کی روشنی میں کرے گا کہ کیا میرے لیے اب خلوت گزینی کی رخصت ہے یا نہیں؟ یا کیا میرے لیے شخصی دین و ایمان کو کوئی خطرہ درپیش ہے یا نہیں؟ یہ ہے اس حدیث کا میرے فہم کے مطابق صحیح مفہوم۔

جماعت المسلمین کا لفظ اور بھی کئی احادیث میں آیا ہے اور ہر جگہ اس کے معنی ہیں ”مسلمانوں کی جماعت“۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

((فَإِنَّمَا الْحَيَاضُ فَيُشْهَدَنَّ جَمَاعَةُ الْمُسْلِمِينَ وَدَعْوَتُهُمْ وَيَعْتَزِلُنَّ مَصَلَّاهُمْ)) (۲)

”حائضہ عورتیں بھی مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ عید گاہ میں حاضر ہو جائیں اور ان کی دعاؤں میں شرکت کریں، البتہ ان کی نماز پڑھنے کی جگہ سے الگ رہیں۔“ اس حدیث میں جماعت المسلمین سے مراد وہ مسلمان ہیں جو نماز عید کے لیے جمع ہوئے

(۱) ملاحظہ کیجیے: صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الدین الفرار من الفتن

(۲) صحیح البخاری، کتاب العیدین۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الفتن، و صحیح مسلم، کتاب الامارۃ۔

ہوں۔ یعنی اس سے مراد نماز، عید کا اجتماع ہے، کوئی مخصوص تنظیم مراد نہیں ہے۔ دراصل اُمت مسلمہ اور جماعت المسلمین دونوں ہم معنی ہیں۔ اُمت کے معنی ہیں جماعت اور مسلمہ کے معنی ہیں فرمانبردار، یعنی اللہ کی فرمانبردار جماعت۔ اور اس جماعت میں شامل ہونے والوں کا نام اللہ نے مسلمین رکھا ہے۔ دین اسلام کے ماننے والوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمین بھی کہا ہے، مؤمنین بھی کہا ہے، اُمت مسلمہ بھی کہا ہے، اُمت وسط بھی کہا ہے اور حزب اللہ بھی کہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہی مسلمانوں کو جماعت المسلمین کہا ہے۔ یہ سارے نام اسمائے صفیٰ ہیں اور موصوف واحد کے اپنی صفات کے اعتبار سے کئی نام بھی ہو سکتے ہیں۔ جس طرح کہ مسلمانوں کے افراد و اشخاص اپنے ناموں کے تنوع کے باوجود جماعت المسلمین میں شامل ہیں۔ البتہ موہم شرک یا فرقہ وارانہ نام رکھنا جائز نہیں ہے اور قرآن سنت کے خلاف کوئی چیز دستور اور لائحہ عمل میں شامل کرنا بھی ممنوع ہے۔

(۸) دینی جماعتیں اہل سنت کی برادر تنظیمیں ہیں

دینی جماعتوں پر میرا تفصیلی اور تحقیقی مقالہ جو وفاقی شرعی عدالت کے سوال کے جواب میں لکھا گیا تھا، میری کتاب ”تفہیم المسائل“ حصہ اول میں شامل ہے اور اسی موضوع پر میرا ایک مضمون ”فاران“ میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس لیے اس مضمون میں تفصیل کی ضرورت تو نہیں ہے البتہ دو باتوں کا ذکر مختصراً ضروری ہے۔

(۱) آج پورے عالم اسلام میں اور ہمارے ملک پاکستان میں بھی ”الجماعۃ“ یعنی اقامت دین کا فرض انجام دینے والی اسلامی حکومت موجود نہیں ہے، بلکہ ایسی حکومتیں قائم ہیں جو عملاً لادین سیاست کے اصول پر کام کر رہی ہیں۔ تو کیا اس نظام کو بدلنے اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا اُمت مسلمہ پر فرض ہے یا نہیں؟ اگر فرض نہیں ہے تو پھر طاغوت سے انکار، نبی عن المنکر اور جہاد سے متعلق آیات کا مفہوم کیا ہے؟ اور اگر فرض ہے، اور یقیناً فرض ہے، تو پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس فرض کی ادائیگی کے لیے انفرادی جدوجہد کافی ہے یا اس کے لیے اجتماعی جدوجہد کرنا ضروری ہے؟ میرے خیال میں اس سوال کا جواب ہر ایک کو معلوم ہے کہ ایک نظام کو مٹانے اور اس کی جگہ اسلام کا اجتماعی نظام لانے کے لیے اجتماعی جدوجہد کا نظام قائم کرنا ضروری ہے اور اس اجتماعی جدوجہد کے نظام کو جماعت یا تنظیم کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ فرض کا موقوف علیہ بھی فرض ہوتا ہے

لہذا اقامت دین کی جدوجہد کے لیے دینی جماعتیں بنانا ضروری ہے۔ اس کے شرعی دلائل اور جماعت سازی کی شرائط وحدود میرے محکمہ بلا مقالے میں بیان کر دی گئی ہیں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ طریقہ کار، حکمت عملی، تدابیر، مصالح، مرسلہ اور تنظیم و تربیت کے نظام میں تنوع اور اختلاف آراء کی وجہ سے ایک ہی مقصد کے لیے ایک سے زائد دینی جماعتیں اور تنظیمیں بھی بنائی جاسکتی ہیں، لیکن جب سب کا مقصد اقامت دین اور نفاذ شریعت ہو اور ان کے دستور، منشور، طریقہ کار اور سرگرمیوں میں قرآن و سنت اور اصول اہل سنت والجماعۃ کے خلاف کوئی چیز موجود نہ ہو تو ان دینی جماعتوں کی حیثیت اہل سنت کی ذیلی برادر تنظیموں کی ہوگی اور سب کی سب عالمی ”الجماعۃ“، یعنی اہل سنت والجماعۃ کی ذیلی شاخوں کی طرح باہمی تعاون و تناصر کے ساتھ اقامت دین کے لیے کام کریں گی، بشرطیکہ پارٹی اور جماعتی تعصب کے جراثیم سے یہ جماعتیں محفوظ ہوں۔ پارٹی تعصب سے مراد یہ ہے کہ اپنی پارٹی کو عملاً معیار حق کا درجہ دے دیا جائے، جو اپنی پارٹی میں شامل ہو اس کی غلط بات کی بھی تائید کی جائے اور جو دوسری پارٹیوں میں ہو تو اس کی اچھی بات کی بھی تردید کی جائے۔ اُمت کو حزب اقتدار اور حزب اختلاف میں تقسیم کرنا اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ دینی اور اسلامی تحریکیں اگر جسد واحد کے مختلف اعضاء کی طرح کام کریں گی تو ملی یک جہتی اور اُمت کی وحدت کو ان تحریکوں کی کثرت سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، لیکن اگر ان کے درمیان حسد و بغض اور رقابت و محاصمت پیدا ہوگی تو پھر اچھے سے اچھا دستور و منشور اور اعلیٰ وارفع نصب العین رکھنے کے باوجود ایسی جماعتیں اُمت مسلمہ کے اتحاد کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں نسل، زبان، علاقائیت اور فرقہ واریت کی بنیاد پر جماعت سازی کی اجازت نہیں۔ وصلى الله على سيدنا محمد وعلى آله واصحابه اجمعين



تنظیم اسلامی کا پیغام نظام خلافت کا قیام



تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظام خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: حافظ عاکف سعید

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان اور سرچشمہ یقین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانی اور اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک پلہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃ ثانیہ - اور - غلبہٴ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ